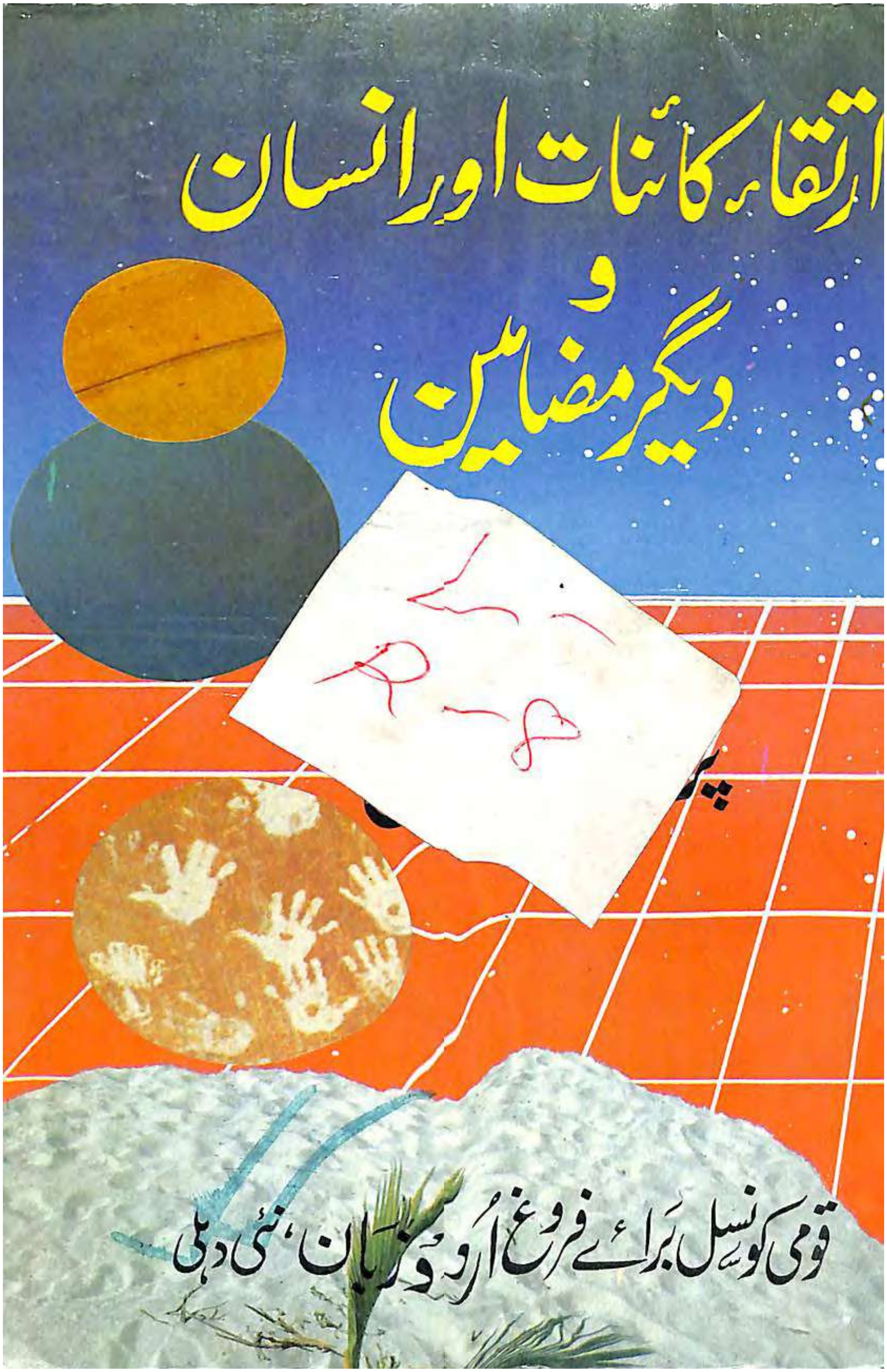
ارتقاء، کائنات اور انسان
و
دیگر مضامین
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ارتقاء کائنات اور انسان
و
دیگر مضامین

پروفیسر بی شیخ علی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔۱، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

Irtiqa Kainat Aur Insan

By : B. Shiekh Ali

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت: جولائی، ستمبر 1998ء شک 1920ء

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : 94/=

سلسلۂ مطبوعات : 811

ناشر : ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔I، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"۔

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں۔ سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشو ونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائریکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

1	پیش لفظ	
2	ارتقا میں انسان کا مقام	7
3	اسلام میں اخلاقی شخصیت کی تعمیر	15
4	مولانا جلال الدین رومیؒ	27
5	سید جمال الدین افغانی	43
6	مولانا محمد علی جوہر	54
7	حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کا پیغام	76
8	سر مرزا محمد اسمٰعیل	87
9	پروفیسر رشید احمد صدیقی	97
10	حضرت نفیس بنگلوری	108
11	یاد رفتگاں	118
12	اسلام میں اعلا اقدار کی اہمیت	132

13	شہادت کا فلسفہ	141
14	اسلامی سائنس کا تاریخی پس منظر	151
15	اخوان المسلمین۔ ایک مصری اسلامی تحریک	163
16	اقوام متحدہ کا تاریخی پس منظر اور تنقیدی جائزہ	176
17	دنیا میں امن کے لیے کیا چاہیئے ؟ خون چاہیئے۔	190
18	اسحٰق رابن کی موت کیا کہہ رہی ہے ؟	197
19	عجز بندگی کی ایک بے نظیر مثال	205
20	ملناڈ کے "سرسید"	215
21	اسلامی عہد اولیٰ میں خواتین کا مقام	231
22	اکیسویں صدی میں ٹکنالوجی اخلاقی اقدار کی ضرورت	242

ارتقا میں انسان کا مقام

یہ کائنات ہم جو دیکھ رہے ہیں یہ ایک وقت مالک کے "کُن فیکون" سے وجود میں نہیں آئی۔ کروڑہا صدیوں میں بستے بستے یہ بستی بنی ہے۔ پانی، ہوا اور مادہ کی آمد کے لیے ہی کروڑہا سال لگ گئے ہوں گے۔ جمادات، نباتات و حیوانات کے ظہور کے لیے ہی مزید کروڑہا سال درکار ہوئے ہوں گے۔ یہ نیلگوں آسماں، یہ آفتاب، یہ مہتاب، یہ ستارے، یہ کہکشاں، یہ مچلتے سمندر، یہ ابلتے طوفان، یہ گھنے جنگلات، یہ شجر یہ حجر، یہ مرغ یہ ماہی، یہ پھول یہ پتے، یہ لالہ یہ نسرین، یہ چرند یہ پرند وغیرہ نمودار ہونے کے بعد ہی حضرت انسان تشریف لائے اور فرزند آدم بھی فوراً ہی موٹر کار، طیارے، کمپیوٹر اور

راکٹ سنبھالتے ہوئے اپنے اپنے محلوں وقصروں میں ٹپک نہیں پڑے، بلکہ ہر چیز ارتقا سے حاصل ہوئی ہے۔ قدرت کا کھیل عجیب ہے۔ یکے بعد دیگرے عناصر ایسے جڑے ہوئے وجود میں آئے جیسے جسم میں جان۔ قدرت کا منشا حیات ہے اور یہ حیات بھی ایسے نشیب وفراز، پتھریلے سنگین اور پُرخطر وادیوں سے گزر کر انسان تک پہنچی ہے جس کا اندازہ ہماری قیاس سے باہر ہے۔

حیات کا مدعا حیوان کی طرح جیتا جاگتا، چلتا پھرتا، کھاتا پیتا اور ہنستا بولتا، انسان کی صورت میں ایک اور جاندار تشکیل دینا نہیں ہے، اور نہ تن آسان عرشیوں کی طرح ذکر وفکر وتسبیح و طواف میں غرق ایک اور خلقت کی تخلیق ہے، بلکہ ایک ایسی مخلوق کو جنم دینا ہے، جو قدرت کے راز کو سمجھے، جو خالق کے صفات کا آئینہ بنے، جو حسن وجمال وکمال میں مالک کا نمونہ بنے اور جو صحیح معنوں میں خلیفۃ الارض کا شرف پائے۔ انسان تخلیق کا معراج ہے، ارتقا کی آخری منزل ہے، قدرت کی منشا کا آخری کھیل ہے، اس ڈرامہ کا آخری منظر ہے۔ اس کے بعد پردہ گرے گا، شاید حشر ہوگا، شاید پھر

کوئی دوسرا تماشہ ظہور میں آئے گا۔ لیکن اس ڈرامہ کا آخری سین ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ پلاٹ کی گتھیاں ابھی سلجھی ہوئی نہیں ہیں۔ ابھی حیرت و ششدر جاری ہے۔ ہر منظر پیچ و تاب سے بھرا ہے۔ ایک سے ایک سنسنی خیز سین ابھر رہا ہے، جس میں وحشت و دہشت بھی ہے، الفت و پیار بھی ہے، دولت و عزت بھی، غربت و ذلت بھی، تعمیر و تخریب بھی، تعلیم و تربیت بھی اور جہالت و نکبت بھی۔ انسان بندر کا ناچ، ناچ رہا ہے۔ مگر حیات کا مدعا ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوا ہے۔ وہ رازِ دروں جو سینۂ یزداں میں ہے۔ ابھی فاش نہیں ہوا ہے۔

مگر یہ راز، راز نہیں ہے۔ ڈرامہ کے خالق نے روزِ ازل ہی اپنے چہیتے تخلیق حضرت انسان کو عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ کہتے ہوئے خزانے کی کنجی دے دی ہے۔ آدمؑ سے لے کر ختم الرسلؐ مولائے کُل تک رازِ دروں حیات کی تشریح مالک نے ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ حیات کا مدعا ذہن کی آب و تاب روشنی ہے۔ حیات کا مدعا عقل و دل و نگاہ کا شعور ہے۔ حیات کا مدعا قلب سلیم میں ضمیر پاک کی تجلّی ہے۔ حیات کا مدعا روح کی لطافت و پاکیزگی کا مظاہرہ ہے۔ حیات کا

مدعا تدبیر و تنظیم سے قدرت کے خزانوں کا سراغ لگانا ہے۔ حیات کا مدعا تفکر و تدبر سے تقدیر کو بھی بدلنا ہے، حیات کا مدعا ہے کہ سوز و ساز و درد و داغ سے عشق کا مقام پانا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس سرزمین کو بہشت کا نمونہ بنانا ہے۔

مگر یہ مدعا پورا نہیں ہو رہا ہے۔ انسان میں حیات آتے آتے ارتقا کی کمزوریوں کو بھی اپنے ساتھ سمیٹ لے آئی ہے۔ انسان میں جمادات کا جمود اب بھی باقی ہے۔ زمین جنبد، آسماں جنبد، نمی جنبد گل محمد خاں، اب بھی موجود ہیں۔ کچھ بھی ہو وہ بدلتے ہی نہیں۔ اپنی ہی چال، اپنا ہی ڈھنگ، اپنی ہی ڈگر پرست، گو کہ زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہے۔ انسان کے دل میں پتھر کی سختی بھی ہے۔ پتھر شاید تڑخ جائے، لیکن انسان کی ہٹ دھرمی، بیدردی و بے رحمی میں کسی طرح کا فرق نہ آئے گا۔ اسی طرح انسان نباتات کی فطرت سے بھی خالی نہیں۔ نہ حس نہ حرکت، نہ رحم نہ کرم۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ چلتا پھرتا لاشہ ہے۔ کبھی کبھی نباتات سے بھی ایک زینہ نیچے آجاتا ہے۔ لکڑی خود جلتی ہے لیکن دوسروں کے لیے کھانا تیار کرتی ہے لیکن بُرٹس سیزر کی میز پر رات کو کھانا کھاتا ہے اور صبح کو سیزر کی پیٹھ پر

پھرا گھونپتا ہے۔ایک درخت لکڑ ہارا کو بھی سایہ سے محروم نہیں رکھتا لیکن ہابل قابل حقیقی بھائی بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے ہیں۔ انسان حیوانات کی چال بھی نہیں بھولا، لومڑی کی چالاکی، سانپ کا زہر، بچھو کا ڈنک، شیر کا غرّانا، ریچھ کی پکڑ، گدھے کا بھدّاپن وغیرہ وغیرہ فرزند آدم میں آج بھی موجود ہے۔قدرت کی عطا کی ہوئی حیوانات میں جو فطری خوبی ہے، اُس کو نظر انداز کر جاتا ہے، نہ اونٹ کا صبر و استقلال، نہ جگنو کی چمک، نہ پروانہ کا عشق، نہ مچھلی کی تڑپ اور نہ کتے کی وفاداری کا کچھ اثر اس پر پڑا ہے۔ انسان میں شیطان کے صفات بھی پائے جاتے ہیں۔ وہی فتنہ، وہی فساد، وہی تکبر، وہی سرکشی، وہی خود غرضی، وہی فریب، وہی مکر، لیکن اِن کمزوریوں پر قابو پانے کی سکت بھی رکھتا ہے۔ اس کے پیار و الفت میں شہد کی مٹھاس بھی ہے، اُس کے کام میں چیونٹی کا انہماک بھی ہے، اُس کے کلام میں طوطے مینا کی بول سے بڑھیا بول بھی ہے، اُس کے ہاتھ میں قدرت کی عکاسی کی قوت بھی ہے اور اس کی عقل میں پرواز کی طاقت بھی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ یہ کبھی حیوان ہے کبھی انسان۔

نہ پورے طور کا حیوان نہ پورے طور کا انسان۔ غیض و غضب پر آترے تو درندے سے بدتر اور اگر نیکی کی طرف مائل تو فرشتہ سے بہتر۔ حیات کی یہ آزمائش اس وقت تک جاری رہے گی۔ جب تک یہ پورا انسان نہ بن جائے۔

پورا انسان کب ہوگا؟ اس وقت جب کہ وہ خود کے لیے نہیں دوسروں کے لیے زندہ رہنا سیکھ لے گا۔ حیات کی بخشی ہوئی زندگی کی نعمت کو اوروں کے لیے وقف کر دے گا۔ جب تک وہ خود کے لیے جئے گا حیات کی مدعا سے دوری محسوس کرے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ انسان عشق کے مقام کو اچھی طرح جان لے۔ حیات کا منشا انسانوں کے دلوں میں محبت کی آگ بھڑکانا ہے۔ جب تک یہ اخوت و مساوات ہمدردی و برادری، اخلاص و پیار کے ناتے میں نہیں جڑ جاتا، قدرت کے امتحان میں پاس نہیں ہوگا۔ موت و حیات کی ہولی ہی کھیلتا رہے گا اور حیاتِ جاوداں کا حقدار نہ بنے گا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ انسان اپنی حیات کے اس پہلی منزل کو طے کر کے مالکِ حقیقی سے جب تک دل نہ لگائے گا، وہ بھٹکتا ہی رہے گا۔ انسان قانون و شرع سے آگے قدم رکھے،

پنج گانہ صلوٰۃ نہیں، صلوٰۃ دائمون کا طریقہ سیکھے، مالک کو پہچانتے کا سلیقہ جانے۔ اپنے دل کو نور توحید سے منور کرلے، معرفت کے موتی کو اپنی روح میں بھرلے۔ ذکر وفکر و تسبیح و تقویٰ سے قرب الٰہی حاصل کرے اور اپنی حقیقت جان لے۔ یہ آسان کام نہیں۔ مگر جب تک یہ مدعا پورا نہ ہو ہمارے ڈرامہ کا اختتام نہ ہوگا۔

ارتقا اور بھی کچھ چاہتا ہے۔ انسان کو عقل برہانی کے ساتھ عقل روحانی و نورانی بھی بخشی گئی ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گزر رہا ہے۔ عقل برہانی تیز سے تیز تر ہو رہی ہے۔ حیرت انگیز تجربات سے انسانی زندگی آرام دہ بن رہی ہے۔ سائنسی انقلابات سے ستاروں کے گزر گاہوں کو ناپنا، زماں و مکاں کی پابندیوں کو توڑنا، عناصر پر حکومت کرنا، صحرا کو لالہ زار بنانا وغیرہ آج کل معمولی باتیں بن چکی ہیں۔ عقل برہانی اپنے شباب پر ہے مگر عقل روحانی و نورانی اسی مناسبت سے پیچھے ہٹ رہی ہے۔ رحم وکرم، حق و انصاف، محبت و مروت، ایثار و قربانی، حیا و پارسائی، صبر و قرار رفتہ رفتہ زائل ہو رہے ہیں۔ روحانی قوتوں کو پانے کا پہلا زینہ ہاتھ سے جا رہا ہے۔

قدرت کا جو تقاضیٰ ہے کہ صفات الٰہی کی جھلک انسان میں ہو وہ نظر نہیں آتی ۔ علم برہان کے ساتھ علم عرفان بھی بہت ضروری ہے۔ علم عرفان ہیں دیگر قسم کی بصیرت انسان کو ملے گی جو روح کی غذا ہوگی، وہ عشق کا مقام ہوگا۔ اُس منزل کے لیے انسان کو ابھی بہت کچھ پاپڑ بیلنا ہوگا۔ جب وہ اس مقام پر پہنچے گا تو ارتقا کے مدعا کا حامل بن جائے گا۔ اور انسانِ کامل کا درجہ پائے گا جس کے لیے عشق بہت ضروری ہے ؎

"عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفٰے
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام"

اسلام میں اخلاقی شخصیت کی تعمیر

بشر کے تین رشتے ہیں، خالق سے رشتہ، خود سے رشتہ اور خلقت سے رشتہ۔ ان تینوں کی اصلیت و حقیقت سے مذہب و ملت کی خمیر بنتی ہے۔ ان تینوں کے مرکب سے اخلاقی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے اور اخلاقی شخصیت اسلام کا مرکز محسوس ہے۔ اخلاقی شخصیت کی تشریح یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی قدرت کے قانون کے تابع کرلے۔ ساری کائنات قدرت کے ایک زبردست قانون سے منسلک ہے اور اس میں کوئی ترمیم و تنسیخ ممکن نہیں۔ سورج مغرب سے نکل نہیں سکتا۔ مچھلی زمین پر زندہ نہ رہ سکے گی۔ آگ میں ٹھنڈک نہ ہوگی، برف میں گرمی، پتھر میں نرمی نہ ہوگی، وغیرہ، وغیرہ، یہ اٹل قانون انسانی زندگی سے بھی وابستہ ہے۔ اس پر عمل پیرا ہوں تو کامیابی و

کامرانی ہے، خلاف ورزی ہو تو زحمت و ذلت و رسوائی ہے۔
اسلامی تعلیمات میں قدرت کے سبھی قوانین کو جاننے، سمجھنے، پرکھنے اور اُن پر عمل کرنے کا نام، ایمان، اسلام رکھا گیا ہے، اور ایمان، اسلام کی بنیاد پر ہی اخلاقی شخصیت کا قصر تعمیر ہوتا ہے۔

قدرت کے اس قانون میں بشر کا مقام ارتقا کی سب سے اونچی چوٹی پر ہے، یعنی انسان کا وجود تخلیق کا معراج ہے، شجر، حجر، مرغ ماہی، زمین آسمان نہیں۔ آدم کا وجود جنّت میں ہوا۔ کیا پاکیزہ مقام، کیا بہشت بریں! قدرت کے قانون سے ذرا انحراف، اور نفس کی خواہش پر تھوڑی سی لغزش، جنّت سے آدم باہر پھینکے گئے۔ فرزندِ آدم سے اب تک بھی لغزشیں جاری ہیں۔ قدرت کہتی ہے کہ حق پر رہو، یہ ہمیشہ ناحق کا دلدادہ ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ عقل و شعور سے کام لو، یہ جذبات میں بہہ جاتا ہے۔ قدرت کہتی ہے مرنا برحق ہے، عاقبت کا توشہ تیار کرلو، یہ یہاں ایسے جیتا ہے کہ "سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں۔" قدرت کہتی ہے کہ جود و سخا، ہمت و دلیری، بردباری و استقلال، صبر و ضبط، نرمی و ملائمت سے روحانی مسرت بھی ملے گی۔

اور دُنیوی سرخروئی بھی، لیکن یہ ہر کام اس کے برعکس ہی کرے گا۔ قدرت کہتی ہے کہ شرم و حیا، پارسائی و عفت، رضا و قناعت، یادِ الٰہی و خوف خدا سے اپنے دلوں کو منور کر لو، لیکن یہ لہو و لعب، عریانی و مے خوری، عیاشی و وحشت سے اپنی روح کو داغ داغ کر لیتا ہے۔ اسلام کا قانون بتاتا ہے کہ حدود شریعت کی حفاظت، عبدیت و عجز بندگی کا احساس، ناموس و لطافت کا تحفظ، خدا شناسی و مولا کی قدردانی، طاعت و عبادت فرزند آدم کو فوق البشر کے زینہ تک پہنچا دیتا ہے، لیکن یہ سرکشی و تکبر، قوتِ شہوت و قوتِ غضبیہ میں مست نظر آتا ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ اعتدال، توازن اور میانہ روی اختیار کرو۔ لیکن یہ اسراف، خرافات و افراتفری میں مبتلا رہتا ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ ذکر و فکر، توبہ و تقویٰ، توکل و توفیق، خضوع و خشوع سے خوشنودیٔ خداوندی کے حامل بن جاؤ، لیکن یہ ہوا و ہوس کے جھمیلوں میں ایسا پھنسا رہتا ہے کہ گناہوں کے دلدل سے نکل آنا مشکل نظر آتا ہے۔ اخلاقِ شخصیت کا تقاضیٰ ہے کہ قدرت کے قانون کی تعمیل کرے اور اِس کے خلاف ورزی سے احتراز کرے۔

اخلاقِ شخصیت ہر مسلمان کے دل کو نورِ ایمان سے بھر

دیتی ہے۔ قلب وروح کی غذا توحید ہے۔ یہ غذا رحمانی، ربانی، و کبریائی صفات کو دل میں سمولیتی ہے۔ جس سے بندہ صحیح معنوں میں انسان بنتا ہے۔ اسی شغل کا دوسرا نام اخلاقی شخصیت کی تعمیر ہے۔ یہ خداشناسی کا مقام ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ معجزہ تھا کہ جب وہ خود ذکر کرتے تھے تو پہاڑ اور طیور بھی ان کا ساتھ دیتے تھے۔ ایمان یہ چاہتا ہے کہ ظاہرو باطن، ہر جگہ اللہ ہی کا ظہور رہے۔ اللہ پر ہمارا ایمان پختہ ہو تو قلب غیراللہ سے صاف اور کدورتوں سے پاک ہو کر نوراللہ کا محور بن جاتا ہے۔ ہمارا دل ہر رنگ میں راضی بہ رضا رہتا ہے۔ اُسی پر توکل، اُسی پر تکیہ، اسی کی اطاعت، اسی کی صفات، ہماری زندگی کا آئینہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے اخلاقی شخصیت کی پہلی شرط خدا بینی ہے۔ احدیت کا، وحدت کا اور وحدانیت کا استقبال ایسا ہے جیسے تن کا اعتراف من کے ساتھ۔ روح کے بغیر جسم تن مردہ ہے، چاہے جلا دو، چاہے دبا دو۔ مالک ہماری ہر خطا معاف کرے گا، شرک کی نہیں۔ اِس ایمان کی مضبوطی اخلاق کی تعمیر کے لیے ازبس ضروری ہے۔

اخلاق کی تربیت کی دوسری شرط خود بینی و خود شناسی ہے۔
مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ، اسی کا نام ہے۔ انسان کا دل اللہ کا گھر ہے ۔ جب دل صاف ہو اور ہر قسم کی کثافت سے پاک ہو تو قدرت کی تجلی اِس میں چمکتی ہے۔ اس نور سے فیضانِ سماوی ہاتھ آتا ہے۔ اس کے لیے علم و عمل چاہیئے وہ علم بھی جو آنکھ کی بصارت، کان کی سماعت و ہاتھ کی حرکت سے حاصل ہوتا ہے اور وہ علم بھی جو مالک کی محبت کو دماغ میں سمو کر خونِ جگر سے دل میں نورِ نظر پیدا کرتا ہے۔ بندہ کو یہاں کا بھی خیال رکھنا ہوگا اور وہاں کا بھی۔ وہ یہ یاد رکھے کہ مالک حقیقی نے جس قدر صلاحیت انسان میں بھری ہیں اس کے عشر عشیر کا بھی اب تک پورا پورا فائدہ اٹھایا نہیں جا رہا ہے۔ ہزاروں سال کے بعد اب کہیں کچھ کچھ قدرت کے عناصر پر حکومت کی جا رہی ہے۔ چاند پر قدم رکھنا، تنکے کو توڑ کر برقی قوت حاصل کرنا، دل کے بجھتے چراغ کو پھر سے بھڑکانا وغیرہ، غیر معمولی کمالات نہیں۔ اس سے بھی بڑے کمالات پہلے ظہور میں آچکے ہیں۔ بھڑکتی آگ کو ابراہیم علیہ السلام نے گلزار پایا۔ حضرت موسیٰؑ نے سارے

پہاڑ کو سرمہ بنایا۔ حضرت عیسیٰؑ نے مُردے کو زندہ کیا۔ انسان میں ایسی قوتیں موجود ہیں جو کائنات کے راز کو فاش کر سکتے ہیں۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ کمال کی حد کو پہنچ چکا ہے۔ اسی شب و روز میں الجھ کر نہ رہ جائے۔ تیرے سامنے زمان و مکان اور بھی ہیں۔ انسان یہ سمجھتے ہیں کہ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

تیسری اہم بات خلقت سے رشتہ کی ہے۔ قدرت میں ہر شئے کسی دیگر شئے کے لیے بنائی گئی ہے، خود کے لیے نہیں۔ کائنات کی ہر تخلیق سے انسان فائدہ اٹھانا جانتا ہے۔ لیکن اپنی طرف سے قدرت کو کچھ دینا نہیں جانتا۔ قدرت کا دیا ہوا پٹرول ختم ہو جائے تو پھر زمین میں پٹرول بھرنا کہاں ممکن؟ کوئلہ ختم ہو جائے یا دھات ختم ہو جائے یا دریاؤں میں پانی نہ رہے، یا آسمان سے پانی نہ برسے تو مجبوریوں کا شکار بن جاتا ہے اس لیے اخلاقی شخصیت کے لیے ضروری ہے کہ انسان حقوق العباد کو اچھی طرح سمجھے۔ خالق کی وحدت کا رشتہ خلقت کی وحدت سے جڑتا ہے، جہاں دین حق کا مدعا خدمت خلق بتایا گیا ہے۔ ہمدردی و انسانیت کو عبادت کا

درجہ دیا گیا ہے۔ ایثار و قربانی مومن کی شان کہا گیا ہے ، خدمت اہل جہاں کو عز و شانِ انبیاء کا شرف بخشا گیا ہے، خلقت سے محبت و مروت، رحمتِ رب کی شرط کہی گئی ہے، انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے ۔ علامہ اقبال کا کہنا ہے کہ جب تک تمام دنیا کی تعلیمی قوتیں اپنی توجہ کو انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کریں تو یہ دنیا بد ستور درندوں کی بستی بنی رہے گی ۔ ہر جگہ دوسروں سے بے جا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ غریبوں کا خون چوسا جاتا ہے ۔ عوام کے حقوق کو کچلا جاتا ہے۔ عوام جو پہلے ہی دوسروں کے فائدے اور منافع کے لیے محنت و مشقّت کرتے ہیں ۔ ان کی غربت ، نکہت و سسکتی بلکتی حالت پر کوئی ترس نہیں کھاتا ۔ اُنھیں کے خون پسینہ سے اپنے عیش و عشرت کے سامان تیار کروائے جاتے ہیں ۔ اخلاقی شخصیت کا تقاضا ہے کہ انسانوں میں مساوات کا جذبہ ابھارا جائے ۔ غریبوں ، یتیموں ، مسکینوں ، مزدوروں کا خاص خیال رکھا جائے ۔ حق معیشت سب کے لیے برابر و مساوی ہے ۔ اللہ کی دی ہوئی دولت مالدار لوگ سونے چاندی کے زیورات ، حریر و دیبا کے نازک کپڑے ، چاندی سونے

کے برتنوں کا استعمال، عالیشان و پُر شکوہ و رفیع الشان محلات کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش و نمائش پر خرچ نہ کریں بلکہ کروڑوں نفوس کی بہتری و بہبودی پر بھی اپنی توجہ مبذول کریں۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ بہترین کمائی مزدوروں کی کمائی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں قُلِ الْعَفْوَ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی حاجت سے زیادہ مال نہ رکھو۔" ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ،، کا حکم ہے۔ کوئی شئے بذات خود کسی شخص کی بھی ملکیت نہیں۔ اللہ کی دین ہے۔ اس میں دوسروں کا بھی حصّہ ہے۔ اسی لیے زکوٰۃ کو فرض میں داخل کر دیا گیا۔ قرآن سرمایہ داروں کے لیے پیام موت ہے۔ سود کو حرام قرار دیا گیا۔ زمین سے صرف پیداوار کی اجازت ہے۔ مسلمان کو یہ حکم دیا گیا کہ تیری بنیادی ضروریات سے زیادہ جو کچھ بھی ہے اس کو اجتماعی مفاد کے لیے دے دیا جائے۔ اسی لیے بیت المال کا اجرا ہوا۔ اگر آج بھی ہم زکوٰۃ برابر دیں، عوام کا خیال رکھیں۔ اور اپنے اوقات کا صحیح استعمال کریں تو ہمارے کئی معاشی مسائل حل ہو سکیں گے۔ اس کے لیے اخلاقی شخصیت چاہیئے۔ چوتھی اہم بات یہ ہے کہ قدرت کے قانون میں تخلیق کا راز محبّت

پر منحصر ہے۔ کسی بھی جاندار کا وجود محبت کے بغیر نہ ہو گا چاہے وہ انسان ہو یا حیوان۔ مالک کی صفت رحمٰ سے ہی یہ کائنات ظہور میں آئی۔ اس کا رحم و کرم نہ ہو تو ہمارے عصیاں کے سمندر میں ہم ایک پل بھر بھی زندہ نہ رہ سکیں گے۔ مالک چاہتا ہے کہ بندے بھی پیار و اخلاص، محبت و مروت سے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیں۔ کسی بھی شئے یا امر سے اُنس و محبت نہ ہو تو نہ وہ وجود میں آئے گی، نہ نشو و نما پائے گی، اور نہ پھلے پھولے گی "عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولین ہے عشق۔ عشق نہ ہو تو شرع و دین بتکدۂ تصورات"۔ عشق کا مقام بہت اعلا و ارفع ہے۔ عشق الٰہی ایمان کی جڑ ہے۔ عشق رسولؐ اسلام کی روح ہے۔ عشقِ بندگان وسیلۂ خوشنودیٔ خداوندی ہے۔ کام سے عشق کامیابی کا راز ہے۔ اولاد سے عشق فطرت کا تقاضہ ہے۔ اسی طرح جب تک عشق نہ ہو، نہ دولت، نہ ثروت، نہ عزت اور نہ فضیلت ہاتھ آئے گی۔ اخلاقی شخصیت کے لیے اخلاص و پیار، محبت و مروت بے حد ضروری ہے۔

اخلاقیات میں پانچویں اہم بات جمالیات کی ہے۔ قدرت میں ہر شئے خوب صورت ہے۔ حسن آئینۂ حق ہے۔

مالک احسن الخالقین ہے۔ اسلام کا دوسرا نام حسن اخلاق ہے۔ خالق کی ہر چیز میں حسن ہے۔ حسن بھی ایسا کہ جس میں قدرت کی شان چمکتی ہو۔ جس سے قدرت کا راز ٹپکتا ہو۔ ہر شئے میں پاکیزگی، ہر شئے میں موزونیت، ہر شئے میں تناسب، ہر شئے مفید، ہر شئے حسین۔ ہر شئے کے عناصر بالکل برابر، نہ کم نہ زیادہ، کہیں افراتفری نہیں، کہیں اسراف یا تخفیف نہیں۔ انسان کو ایک دماغ دیا، دو نہیں تاکہ ایک دوسرے سے جھگڑ نہ بیٹھیں۔ ایک دل دیا تاکہ ساری خلقت ایک دل ہو جائے، تاکہ دوئی سے نفرت کی آگ نہ بھڑکے ایک زبان دی، تاکہ بات کے پکے بنو، مگر دو آنکھ دیے، دو کان دیے، دو ہاتھ دیے، اور دو پیر دیے، تاکہ خوب دیکھو، خوب سنو، خوب کام کرو اور خوب چلو پھرو۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ تنکے سے لے کر فلک کے ہزاروں برجوں میں جمالیات کا یہی پہلو نظر آتے گا۔ اس کے برعکس انسانوں کے کرتوت کئی وقت کتنے گندہ ہیں؟ اخلاقی شخصیت کے لیے جمالیات کا سبق بہت اہم ہے۔

اخلاقیات کا چھٹا اہم رکن حق و انصاف ہے۔ قدرت

ہیں ہر جگہ انصاف ہے، آراستگی، با ضابطگی، اور تنظیم ہے۔
ہر چیز میں ایک خاص صفت ہے۔ وہ بدلے گی نہیں۔ پھول ہو تو خوشبو، سورج ہو تو روشنی، شبنم ہو تو ٹھنڈک، شہد ہو تو مٹھاس، بجلی میں چمک، دریا میں روانی، چیونٹی میں انہماک، مچھلی میں تڑپ، پارے میں اضطراب، طاؤس میں رنگ، بلبل میں آواز وغیرہ وغیرہ، ہر شئے اپنی صفت سے مجبور ہے۔ بشر میں بھی کوئی صفت ہو۔ اُس کا وجود بھی کوئی خاص غرض و غایت سے لگا ہوا ہے "دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو + ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیان"
"ہو فرشتہ بھی تو نہیں انسان ÷ درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں"
انسان اپنی تخلیق کا مدعا پورا نہیں کر رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ شمع خود جلتی ہے، لیکن دوسروں کو روشنی دیتی ہے۔ لکڑی خود خاک بنتی ہے لیکن دوسروں کے لیے کھانا تیار کرتی ہے اور ایک درخت لکڑ ہار کو بھی اپنے سایہ سے محروم نہیں رکھتا، انسان بسا اوقات غیض و غضب میں غراتا ہوا۔ شیر بن جاتا ہے، زہریلے کرتوت میں ناگ، سانپ کو مات کرتا ہے، عیاری و مکاری میں لومڑی پر سبقت لے جاتا اور

فتنہ وفساد میں شیطان کو شرما دیتا ہے ۔ اخلاقی شخصیت چاہتی ہے کہ فرزند آدم حق و انصاف کو ہاتھ سے جانے نہ دے ۔

آخر میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں اخلاقی شخصیت کا سنگ بنیاد قدرت کے قانون پر رکھا گیا ہے ۔ اِس قصر کا خاکہ توحید کے نور سے منور ہے ۔ اِس محل کے معمار وہ مومن مسلمان ہیں جو خود بینی و خود شناسی سے آشنا ہیں ۔ اس کے مضبوط ستون خدمت اہل جہاں کے اینٹ گارے سے استوار ہیں ۔ اس کے درودیوار کو عشق و محبت کے رنگ سے سنوارا گیا ہے ۔ اس کا فرش حسن و جمال سے مزین ہے اور اس میں حق و انصاف کے باشی بستے ہیں ۔

"راز ہے راہِ تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

مولانا جلال الدّین رومیؒ

بزرگ و برتر ہستی وہ ہے جو عالم موجودات کے خالق کا سراغ لگائے۔ نورِ حق کے راز و رموز کو جانے، پہچانے سمجھے اور سمجھائے۔ علم باطنی کی تہہ کو پہنچ کر فیضانِ سماوی کے اُن کرشموں کو عیاں کرے جس سے شرر شعلہ میں ضم ہوتا ہے۔ اور قطرۂ شبنم بحر بیکراں ہیں۔ یہ سب تصوف کی باتیں ہیں جہاں بشر علوم ظاہرہ کو پیچھے ڈھکیل کر نورِ ازلی کا متلاشی بن جاتا ہے۔ زیست کی حقائق کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر بقا کے گوہر نایاب نکال لے آتا ہے۔ عبدیت کا مدعا پورا کرتا ہے۔ اور فوز عظیم پاتا ہے۔ یہ کام جنھوں نے انجام دیا ہے اُن میں سر فہرست مولانا جلال الدین رومیؒ کا نام نامی آبِ زر سے لکھا ہوا آپ پائیں گے۔

مولانا نے مثنوی میں اُن رکیک، عمیق، اور نازک نکات پر بحث کی ہے۔ جو محسوسات کے دائرے سے ماوراہیں۔ مثلاً الٰہیات، ذات باری، صفات باری، توحید، نبوّت، مشاہدۂ ملائکہ، وحی، معجزہ، جبر وقدر، تصوف، روح وغیرہ، جو ہمارے عقیدے اور مذہب کی جان ہیں۔ کئی اور ایسے دقیق اور عظیم الشاّن مسائل واسرار، جیسے نفس، عقل، عمل، فنا، بقا، وجد، توکل، صبر، شکر وغیرہ کو، جو صوفیہ حضرات کا گنجہائے گرانمایہ ہیں، مولانا نے بصیرت افروز تشریح کا عنوان بنایا ہے۔ان حقائق کو ایسے سمجھا تا کہ عوام کے دل و دماغ میں اتر کر اثر کرے اور مذہب کے صحیح مسائل روز روشن کی طرح واضح ہو جائیں، ایسی وجہ ہیں کہ ان کی مثنوی کو "ہست قرآن در زبانِ پہلوی" (صحیفۂ پاک فارسی میں) کا مرتبہ حاصل ہوا ہے۔ مولانا دقیق نکات کو سمجھانے کا طریقۂ کار تشبیہہ، تمثیل، اور حکایات ہیں۔ جو دلچسپ موزوں اور مدلّل ہیں کہ گویا علم ودانش کے چمکتے دمکتے موتیوں کا ایک بہترین خزانہ ہے جو بکھیر دیا گیا ہو۔

عالم اسلام میں فارسی کی صرف چار تصانیف کو آفاقی

شہرت حاصل ہوئی ہے، وہ ہیں
(۱) شاہنامہ (۲) گلستان (۳) دیوانِ حافظ اور مثنوی رومیؒ۔ مولانا روم کی مثنوی کو جو مقبولیت کا شرف ملا وہ تقدس سے کم نہیں۔ اس کی سادگی، صفائی، برجستگی و دلآویزی کے ساتھ اس میں سعدی کے حکایات کی چاٹ، فردوسی کے انداز بیان کا لطف، حافظ کی ندرت فکر کی جھلک کے علاوہ شمس تبریز، فریدالدین عطار، نجم الدین رازی وشیخ شہاب الدین سہروردی جیسے مشائخ کبیر کے ذکر و فکر کا نچوڑ بھی موجود ہے۔ سونے پر سہاگہ مولانا کی وہ عالمانہ، صوفیانہ، وحکیمانہ جاہ وجلال وشان ہے۔ جس نے مثنوی کو ہمارے مذہبی، تہذیبی، ادبی وعلمی اثاثہ کا انمول رتن بنا رکھا ہے۔

مولانا کا یہ کارنامہ ہے کہ جب وہ الہیات جیسے دقیق مسئلہ پر بحث کرتے ہیں تو ملحد سے ملحد بھی توحید کا قائل ہوتے نظر آئے گا۔ نبوّت، وحی و معجزہ کا ذکر آئے تو بڑے سے بڑا فلسفی بھی ان کے استدلال کی تردید نہ کر سکے گا۔ جبر وقدر کا مسئلہ چھڑ جائے تو عظیم سے عظیم سائنس داں بھی اُن کے خیالات کا احترام کرے گا۔ تصوّف،

روح، فنا و بقا کا تذکرہ اٹھے تو کٹّر سے کٹّر مادہ پرست بھی روحانی حقائق سے منحرف نہ ہو سکے گا۔ اخلاقیات پر جب وہ رقم طراز ہوں تو ضلالت میں ڈوبے ہوئے گمراہ فرد کا ضمیر بھی پکار اُٹھے گا۔ مثنوی کے بے شمار آب دار موتیوں میں سے صرف دو چار کی ہلکی جھلک یہاں پیش کی جا رہی ہے۔

مثنوی میں کل ۲۶۶۶۶ اشعار جو پانچ دفتر میں محفوظ ہیں، چھٹا نا تمام تھا، جسے بعد میں پورا کیا گیا۔ مولانا کی تصانیف میں فیہ ما فیہ اور دیوان بھی شامل ہیں۔ دیوان کافی ضخیم ہے جو پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ لیکن مثنوی ہی اُن کی معرکتہ الآرا تخلیق ہے جو رہتی دنیا تک انھیں عظمت و شہرت بخشتی رہے گی۔ اس میں صرف معرفت کے موتی ہی نہیں رولے گئے ہیں۔ بلکہ اخلاقیات و سچی انسانیت کا سمندر بھی موجزن ہے۔ فلسفہ و سائنس پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تجاذب ذرّات و تجرد امثال و مسئلہ ارتقا پر بھی بحث کی گئی ہے۔ لیکن سب کچھ اس نقطۂ نظر سے جو دین و مذہب سے تعلق رکھتا ہے، قدرت کے غرض و غایت کو عیاں کرتا ہے اور بشر کے ضمیر پاک کی رہنمائی کرتا ہے۔

پہلے الٰہیات کو لیجئے۔ مولانا ذات باری کا وجود مؤثر استدلال سے ثابت کرتے ہیں۔ یہ کائنات ایک عالیشان مشین ہے جس کے پرزے رات دن حرکت میں ہیں۔ ستارے گھوم رہے ہیں، دریا بہہ رہا ہے، پہاڑ آتش فشاں ہے، ہوا متحرک ہے، زمین گردش میں ہے، درخت جھوم رہے ہیں۔ یہ دلیل ہے جو دلالت کر رہے ہیں کہ کوئی پُرزور ہاتھ ہے جو ان پرزوں کو چلا رہا ہے۔ بدن جو حرکت کر رہا ہے زندگی کی وجہ سے۔ تم جان کو نہیں جان سکتے ہو تو بدن کی حرکت کو دیکھ کر زندگی کے وجود کو جان لو۔ یہ سب اپنے آپ کیسے وجود میں آجائیں گے۔ جب تک کہ کوئی خالق نہ ہو؟ تمام عالم میں نظام و ترتیب ہے۔ ایسی ہم آہنگی و باضابطگی کہ ہر شئے مناسب و موزوں ترین طریقہ سے ہی ڈھلی ہے۔ اس لیے ضرور اس کا کوئی صانع ہوگا۔ کوئی شئے بغیر سبب کے وجود میں نہیں آتی۔ کائنات کا وجود ہے تو اس کا کوئی خالق بھی ہوگا۔ "گر حکیمے نیست این ترتیب چیست" کوئی کارساز نہ ہو تو یہ ترتیب کہاں سے آئی؟ دیوار اور چھت کی صورت معمار کے خیال کا سایہ ہے۔ اول فکر ہے، پھر عمل۔ عمل دکھائی دے گا، فکر نہیں۔ لیکن عمل سے فکر کی

موجودگی کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔صورت نہیں ہوتی۔ بے انتہا مذاہب و پیشے سب خیالات کے پرتو ہیں۔رونے کی آواز تو آتی ہے لیکن صدمہ جو پہنچا ہے وہ نظر نہیں آتا۔کوٹھے پر کھڑے لوگوں کا سایہ نیچے دکھائی دیتا ہے۔بغیر لوگوں کے سایہ کہاں؟

جو چیزیں محسوس اور نمایاں ہیں وہ اصلی نہیں۔جو چیزیں کم نمایاں اور غیر محسوس ہیں وہ اصلی ہیں۔تل کے اندر تیل موجود ہے مگر نظر نہیں آتا۔جو چیز جس قدر زیادہ اشرف و برتر ہے اسی قدر زیادہ مخفی و غیر محسوس ہے۔انسان میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔جسم، جان، عقل۔جسم سب سے کم رتبہ ہے،اعلانیہ نظر آتا ہے، روح اُس سے افضل ہے، مخفی ہے لیکن اُس کا بہ آسانی علم ہو سکتا ہے۔ لیکن عقل نظر ہی نہیں آتی۔لیکن عقل کی موجودگی سے انکار نہیں۔ موزونیت، باقاعدگی،منظم حرکت،اختراع،ایجادات سب عقل کی نشانی ہیں۔لیکن عقل بازار میں بکتی نہیں،اُس کا احساسات میں بھی دخل نہیں۔جس طرح جسم کے اعتبار سے روح مخفی ہے۔ اسی طرح عقل روح یا جان سے بھی زیادہ مخفی ہے۔ ہر اعتبار سے مادہ سے بَری اور غیر محسوس اور اشرف جو ذات ہو، وہی خدا ہے۔تمام صورتیں بے صورت سے وجود میں آئی ہیں۔

فاعل مطلق قطعاً بغیر کسی صورت کے ہے۔ صورت اس کے ہاتھ میں بطور آلہ۔ ایک نہیں ایسے کئی تمثیلوں سے مولانا نے ذاتِ باری کے وجود کو ثابت کیا ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ ہے کہاں؟ اشعریہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ عرش بریں پر جاگزیں ہے۔ مولانا نے کہا یہ بحث فضول ہے۔ خدا کی نسبت صرف اس قدر معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ہے۔ باقی یہ کہ کیسا ہے، کہاں ہے، اس کے کیا اوصاف ہیں، یہ سب ادراک انسانی سے بالکل باہر ہیں۔ آفتاب کی روشنی کے سوا آفتاب کے وجود کی اور کوئی دلیل نہیں۔ سایہ کی کیا ہستی ہے کہ آفتاب کی دلیل بنے؟ خدا قدیم ہے اور انسان حادث یعنی اس کی تخلیق ہے۔ حادث قدیم کو کیوں کر جان سکتا ہے؟ مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ایک چرواہے کو دیکھا کہ وہ خدا سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ اے خدا تو کہاں ہے، تو مجھ کو ملتا تو میں تیرے بالوں میں کنگھی کرتا، مزے مزے کے کھانے کھلاتا۔ حضرت موسیٰؑ نے اس کو سزا دینی چاہی، وہ بھاگ نکلا۔ موسیٰ پر وحی نازل ہوئی کہ تو نے میرے بندہ کو مجھ سے کیوں جدا کر دیا۔ تو خلقت کو خالق سے جوڑنے کے لیے

بھیجا گیا ہے یا توڑنے کے لیے ؟ ہر شخص کو میں نے ایک خاص سیرت بخشی ہے ۔ دانا لوگوں کے آداب جدا ہوتے ہیں، عشق و رقت میں پھنسے ہوئے لوگوں کا حال دیگر ہوتا ہے، ہر حال میں ایک ہی قانون نافذ نہیں ہوتا ، طفل آپ کی پیٹھ ٹھونکتا ہے تو اسے سزا نہیں دیتے۔ کعبہ کے اندر قبلہ نہیں ہوتا۔غوطہ زن کو جوتا نہیں چاہیئے ۔

خدا کا تعلق عالم سے اور روح کا تعلق جسم سے ایسا ہے کہ وہ نہ قریب ہے نہ بعید، نہ داخل نہ خارج ، جب لوہا اِس طرح گرم کیا جائے کہ وہ بالکل سُرخ ہو تو یہ کہنا کیسے بے جا ہوگا کہ وہ آگ ہوگیا ہے ۔ آگ میں جو تپش اور گرمی ہے صرف وہ اس میں موجود ہے " میں آتش ہوں، آتش .... وہ ضرور کہے گا۔ آزمانا چاہو تو اس پر ہاتھ رکھ کر دیکھو۔ شمع کی لَو آفتاب کے آگے ہست بھی ہے اور نیست بھی۔ ہست اس لیے کہ اگر اُس پر روئی رکھ دو تو جل جائے گی اور نیست اس لیے کہ اس کی روشنی نظر نہیں آئے گی ۔ اسی طرح ایک من شہد میں ایک تولہ سرکہ ڈالو تو سرکہ کا مزا بالکل نہیں معلوم ہوگا، لیکن شہد کا وزن بڑھ جائے گا ۔ اس لحاظ سے سرکہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ اسی طرح عارف کامل

جب فنا فی اللہ ہوتا ہے تو ہست بھی ہوتا ہے اور نیست بھی۔
ایک دفعہ مجنوں لیلیٰ سے ملنے چلا۔ سواری میں اونٹنی تھی جس نے حال ہی میں بچّہ دیا تھا ، بچّہ ساتھ نہ تھا۔ مجنوں جب لیلیٰ کے خیال میں محو ہو جاتا تو اونٹنی کی مہار ہاتھ سے چھوٹ جاتی اور اونٹنی بچہ کی کشش کی وجہ سے گھر کا رخ کرتی۔ کچھ دیر بعد جب مجنوں کو ہوش آتا تو اُس کا رُخ پھر پھیر دیتا اور لیلیٰ کے گھر کی طرف لے چلتا۔ لیکن دو چار کوس کے بعد پھر محویت طاری ہوتی اور اونٹنی پھر گھر کا رُخ کرتی۔ اسی کشمکش میں مہینے گزر گئے اور ایک منزل بھی طے نہ ہوپائی۔ یہی حال انسان کا بھی ہے جو روح اور نفس کی کشمکش میں پھنسا ہے۔ مولانا کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کی ذات وصفات کے متعلق کچھ نہ کہنا چاہیئے اور جو کچھ کہا جائے گا وہ خدا کے اوصاف نہ ہوں گے، کیوں کہ انسان جو کچھ تصوّر کرتا ہے، محسوسات کے ذریعہ سے کرتا ہے اور خدا اس سے بَری ہے۔

مولانا نے نبوّت کی حقیقت، وحی کی حقیقت، معجزات و مشاہدۂ ملائکہ وغیرہ پر سیر حاصل تشریح کی ہے۔ نبوت کی حقیقت میں کہتے ہیں کہ عام انسانوں کی روح اور پیغمبروں کی روح میں اس قدر فرق ہوتا ہے جس قدر روح انسانی میں۔ لیکن اس درجہ کے

مراتب بھی دیگر ہیں۔ ادنا طبقہ کو ولایت اور انتہائی اعلا طبقہ کو نبوّت
کہتے ہیں۔ وحی کی روح عقل سے بھی زیادہ مخفی ہوتی ہے کیوں کہ یہ
روح عالم غیب کی چیز ہے اور ہمارا عالم دوسرے قسم کا عالم
ہے۔ وحی کی حقیقت صوفیہ حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ انسان
یں ایک اور خاص قوت ہے جو حواس ظاہری کے توسط کے بغیر
اشیا کا ادراک کرتی ہے۔ انسان کو دیے گئے پانچ حواس کے
علاوہ اور بھی پانچ حواس ہیں۔ یہ حواس تانبے کی طرح ہیں اور وہ
حواس سونے کی طرح۔ حواس جسمانی کی غذا ظلمت ہے اور حواس
روحانی کی غذا آفتاب۔ دل کا آئینہ جب صاف ہو جائے تو
اس میں ربانی صفات جھلکتے ہیں۔ دل ایک جوہر نورانی ہے اور
انسان دراصل اسی کا نام ہے۔ وحی اُس مخفی ادراک کا نام ہے۔
جو بغیر تعلم و تعلیم کے محض القا اور الہام کے ذریعہ سے علم حاصل ہوگا۔
رسول اکرمؐ امّی تھے لیکن اُنھوں نے اُمّ الکتاب قرآن پیش کیا۔
متعدد انسان ضرور ایسے رہے ہوں گے جن کو خدا نے علوم و فنون
و صنائع بغیر کسی معلم کے خود سکھلائے ہوں گے اور یہی نبوّت
کی صفت ہے۔

جبرئیلؑ جو انبیاء علیہم السلام کو نظر آتے ہیں اور خدا کی طرف

سے وحی لاتے ہیں وہ حقیقتِ جبرئیلیہ ہے جو انبیاء کی قوتوں میں
سے ایک قوت ہے۔ یہ قوت صورت بن کر عالم مثال میں انبیاء کو
محسوس ہوتی ہے۔ انبیاء اپنے آپ ہی سے مستفیض ہوتے
ہیں کسی اور سے نہیں۔ جو کچھ ان کو نظر آتا ہے وہی ہے جو خود اُن
کے خزانے میں موجود ہے۔ نبوت کی دلیل معجزہ ہے۔ معجزہ
اور استدراج میں فرق ہے۔ جو فرقِ عادت پیغمبر سے صادر ہو
وہ معجزہ ہے اور جو کافر سے ظہور میں آئے وہ استدراج۔
حضرت عیسیٰؑ کا مُردہ کو زندہ کرنا معجزہ اور دجّال کا مُردہ کا زندہ
کرنا استدراج۔ معجزہ کا جواب نہیں ہو سکتا۔ استدراج کا
جواب ہو سکتا ہے۔ ابوجہل میں بُت پرستی میں وہی جوش،
وہی خلوص، وہی سرگرمی واز خود رفتگی تھی جو حضرت حمزہ میں خدا پرستی
میں تھی۔ دونوں نے اسی دھن میں جان دے دی، لیکن ابو جہل،
ابو جہل کہلایا اور حضرت حمزہ، سید الشہداء۔ بھڑ اور شہد کی مکھی
ایک ہی پھول چوستی ہیں۔ لیکن ایک سے شہد نکلتا ہے اور دوسرے
سے نیش۔ دونوں قسم کے ہرن ایک ہی نمونے کا گھاس کھاتے
اور پانی پیتے ہیں، لیکن ایک سے مینگنی اور دوسرے سے مُشک
نکلتا ہے۔ دو اشخاص ایک ہی قسم کی غذا کھاتے ہیں۔ ایک سے

بُغض و حسد نکلتا ہے اور دوسرے سے نور احد۔ نیک اور
بد کی صورتیں ملتی جلتی ہیں، لیکن ایک مخلص اور دوسرا منافق۔
آنکھیں کھولو تو تمیز ہو سکے گی۔ بعض آدمی فطرتاً سلیم الطبع، نیک
دل اور اثر پذیر ہوتے ہیں، ان کا دل نیکی کا اثر جلد قبول کرلیتا ہے۔
مولانا نے عمدہ تشبیہ سے اس کو سمجھایا ہے۔ اگر تم پیاسے سے
کہو کہ پیالے میں پانی ہے، پیاس بجھا لو تو وہ تکرار نہیں کرے گا
کہ پہلے یہ ثابت کرو کہ اس میں پانی ہے۔ اگر ماں یہ کہے کہ میرے
پاس آؤ اور میں تمھاری ماں ہوں تو کیا بچہ یہ کہے گا کہ تم پہلے اپنا
ماں ہونا ثابت کرو، تب میں تمھارا دودھ پیوں گا؟ جس شخص
کے دل میں حق کا مزہ ہے اس کے لیے پیغمبر کی بات اور اُس
کی آواز معجزہ ہے۔ جب پیغمبر دعوت دیتا ہے تو اُس شخص کا
دل اندر سے سجدہ کرتا ہے، کیونکہ اس قسم کی آواز اور اِس
قسم کو دعوت دُنیا میں انسانی کانوں نے نہیں سُنی ہوگی۔ روحانی
آواز ضرور اثر رکھتی ہے۔

غرض اسی طرح کئی ایک دیگر مسائل جیسے روح کی
حقیقت و اہمیت، معاد اور روز جزا کا عقیدہ، جبر و قدر کا
فلسفہ اور اُس کی نوعیت، توحید اور اس کی تشریحات،

وحدت الوجود و وحدت الشہود کی توضیح، عبادات اور تصوّف میں اُن کا مقام، شریعت، طریقت، و حقیقت کی منزلیں، وغیرہ پر مولانا نے ایسی جامع و بسیط بحث کی ہے کہ چاروں طبق روشن ہو جائیں۔ تصوّف کے درباب مولانا نے یوں فرمایا کہ ایک شخص نے علم طب پڑھا۔ یہ شریعت ہے۔ دوا استعمال کی، یہ طریقت ہے، مرض سے افاقہ ہوا، یہ حقیقت ہے۔ شریعت علم ہے، طریقت عمل ہے اور حقیقت اثر ہے۔ شریعت چار چیزوں کا نام ہے، اقرار زبانی، اعتقاد قلبی، تزکیۂ اخلاق، امر و نہی پر عمل۔ اعتقاد تین طریقے سے پیدا ہوتا ہے، تقلید سے، استدلال سے، کشف و حال سے، پہلی دو قسمیں شریعت میں داخل ہیں اور تیسری طریقت میں، تصوّف دو جزوں سے مرکب ہے، علم و عمل۔ مجاہدہ و مراقبہ سے وہ حس پیدا ہوتی ہے جو حواسِ ظاہرہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ ایک حوض ایسا ہے جس میں پانی خارجی ذرائع سے بھرا جاتا ہے، لیکن ایسا بھی حوض ہوگا جس کی تہہ میں ایک سوت بھی ہے جس سے فوارہ کی طرح پانی اچھلتا ہے۔ یہ علم باطن ہے۔ یہی علم ہے جس کو علم لدنی یا علم غیبی

یا کشف کہتے ہیں۔ جو انبیاء و اولیائے کے ساتھ مخصوص ہے۔

وحدت الوجود پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خدا وجود مطلق و ہستی مطلق کا نام ہے۔ جس طرح حباب اور موج مختلف ذاتیں خیال کی جاتی ہیں لیکن دراصل ان کا وجود بجز پانی کے اور کچھ نہیں۔ دھاگے میں جو گرہیں لگا دی جاتی ہیں ان کا وجود دھاگے سے کچھ الگ نظر آتا ہے۔ لیکن فی الواقع گرہ دھاگے کے سوا کوئی اور زائد چیز نہیں۔ صرف صورت بدل گئی ہے۔ وحدت الشہود والے دیگر مثال دیتے ہیں۔ آدمی کا جو سایہ پڑتا ہے وہ بہ ظاہر ایک جدا چیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں، جو کچھ ہے آدمی ہی ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں یہ فرق ہے کہ وحدت الوجود کے لحاظ سے ہر چیز کو خدا کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح حباب و موج کو پانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن وحدت الشہود میں یہ اطلاق جائز نہیں، کیونکہ انسان کے سایہ کو انسان نہیں کہہ سکتے۔ مولانا نے اس مسئلہ پر نہایت طویل بحث کی ہے اور آخر میں اپنا مسلک وحدت الوجود ہی قرار دیا ہے۔ اس بحث کے لیے دفتر کے دفتر ہی چاہئیں۔

مولانا کے نزدیک تمام عالم اس ہستی مطلق کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں۔اس بنا پر صرف ایک ذات واحد موجود ہے۔ ذات باری کو ممکنات سے جو خاص نسبت ہے وہ قیاس اور عقل میں آ نہیں سکتا، اور نہ کیف وکشف کے ذریعہ سے۔

اس کائنات میں تین چیزیں محسوس کی جا سکتی ہیں، مادہ، قوت اور عقل۔عقل تمام اشیا میں اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح انسان کے بدن میں جان۔اِسی عقل کا اثر ہے کہ تمام سلسلہ کائنات میں ترتیب و نظام پایا جاتا ہے۔ تمام عالم ایک شخص واحد ہے(اور اُس شخص واحد میں جو عقل ہے وہ خدا ہے)۔جس طرح انسان کے جسم میں متعدد اعضا کے موجودگی کے باوجود وہ ایک شخصِ واحد خیال کیا جاتا ہے، اِسی طرح عالم میں باوجود ظاہری تعداد اور تجربہ کے شئے واحد ہے اور جس طرح انسان میں ایک ہی عقل ہے اُسی طرح تمام عالم کی ایک عقل ہے اور اسی کو خدا کہتے ہیں.

اِس چھوٹے سے مضمون میں مولانا کی بے شمار دیگر تعلیمات کے ذکر کی گنجائش نہیں۔ اتنا کہنا کافی ہوگا کہ مثنوی علوم شرقیہ کا مخزن ہے۔اسرار و حقائق کا دفتر ہے۔ اِس

میں مُشک کی خوشبو بھی ہے۔ اور نورواحد کی روشنی بھی۔ اس
میں رازِ دلبراں کا ذکر بھی ہے اور حدیث دیگراں کا بھی۔
اس میں عشق و رقت کی لذت بھی ہے اور علم و عمل کی بھی۔ اس
میں علم لَدنی بھی شامل ہے اور علم الکلام بھی۔ اس میں نور ازلی و
آفرینش کا بھی تذکرہ ہے اور روزِ جزا کا بھی۔ اس میں عین الیقین
کی بھی دعوت ہے اور حق الیقین کی بھی۔ یہاں روح کے مراتب
بھی سمجھائے گئے ہیں اور مادے کی خصوصیات بھی۔ یہاں
جبر و قدر پر بھی نظر ہے اور قوت ارادی و قوت اجتنابی پر
بھی۔ یہاں معجزات کا بھی دربار ہے اور اسباب و علل کا بھی۔
یہاں عابدوں کی پنج وقتہ نمازوں کا بھی ذکر ہے اور عاشقوں کی
صلوٰۃ دائمون کا بھی۔ غرض یہ ایک گلدستہ ہے عقائد و حقائق کا،
احکام خداوندی کا، ارشاداتِ نبوی کا اور ذہن انسانی کے عروج
کا۔

سید جمال الدین افغانی

سید جمال الدین افغانی کا شمار ملت کی اُن عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے انیسویں صدی عیسوی میں عالمِ اسلام کی بقا کے لیے سر توڑ کوششیں کی، جنھوں نے امّت مسلمہ کے ذہنوں میں ایک انقلابی شورش برپا کی، جنھوں نے ساحرانِ مغرب کی سامراجی طاقتوں کو کچلنے کی ایک اہم مہم چلائی، جنھوں نے صحیح اسلامی نظام حیات و نظام فکر کی تجدید کی، جنھوں نے عوام الناس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، جنھوں نے خواب غفلت میں پھنسے ہوئے ارکان دولت کو حیات ملّی و حیات ذہنی کا پیغام دیا۔ اُن کے عقل و نفس کی اصلاح کی۔ اُن کے طرز زندگی کو بدلا۔ اُن کے سینوں میں علم سمویا۔ اُن کے اخلاق کو سدھارا۔ اُن کے ذہنوں کو مانجھا، اور اُن کے دِلوں کو

بلند آدرشوں سے بھرا۔ ملت اسلامیہ کی خوش قسمتی تھی کہ ایک ایسے نازک وقت پر جب کہ سارے عالم اسلام میں تاریکی ہی تاریکی تھی، سید اسمٰعیل شہید، سید احمد شہید، سر سید احمد خاں، شیخ محمد عبدہ، رشید رضا، شکیب ارسلاں، عبدالقادر مغربی اور سب سے ممتاز سید جمال الدین افغانی جیسی ہستیاں قدرت کی فیاضیوں سے ہمیں عطا ہوئیں۔

سید جمال الدین کی زندگی جلال، جمال و کمال سے بھری ہوئی تھی۔ ان کا خمیر کسی ایک مقام کی مٹی سے ہی نہیں بلکہ سارے کرۂ ارض کے ریزوں سے اٹھا تھا۔ قدرت نے انھیں یہ صلاحیت بخشی تھی کہ وہ صرف عربی، فارسی و ترکی پر ہی حاوی نہ تھے بلکہ انگریزی، فرانسیسی و روسی پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ اُن کا آب و دانہ زمان و مکان سے ہٹ کر کبھی افغانستان، کبھی ہندستان، کبھی انگلستان، کبھی ایران، کبھی خاقان، کبھی نجد، کبھی مصر، کبھی فرانس، اور کبھی استنبول کے دستر خوان سے وابستہ تھا، اور ہر جگہ ان کا جلال و جمال ایسا تھا کہ اقتدار کی کرسیاں لرز جاتی تھیں۔ ذہانت، دوراندیشی، خیالات کی پختگی، زبان کی جادوگری و مقناطیسی کشش ایسی

کہ نوجوانی میں ہی امیر افغانستان محمد اعظم کے وزیر بن گئے لیکن انقلاب شباب پر تھا، وہ تادیر پنپ نہ سکے۔ انگریز تاڑ گئے کہ یہ وہ سمّ قاتل ہے جو برطانوی سامراج کا قلع قمع کر دے گا۔ امیر پر دباؤ ڈال کر انھیں افغانستان سے بھگا دیا گیا۔

وہ ہندستان چلے آئے۔ یہاں پرستاروں کا سیلاب ایسا امنڈ آیا کہ انگریز پھر گھبرا گئے۔ برطانوی تاج کو دھکہ لگنے کا پھر اندیشہ تھا۔ ہندستان سے فوراً نکل جانے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ مگر جاتے جاتے انھوں نے ایسے پتہ کی بات کہی جو آج بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ انھوں نے کہا کہ اِس مُلک کے کروڑوں انسان اگر مکھی بن کر بھنبھناہٹ شروع کر دیں تو انگریز یہاں ایک دن بھی نہ رُک سکیں گے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے دل میں حریت و حب الوطنی کا کس قدر جوش تھا۔ اغیار کو ملک سے نکالنے کا کس شدت سے ارادہ تھا، اور اس ملک کی آزادی میں حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ سے لے کر مولانا آزاد تک مسلمانوں کا کیا حصّہ رہا تھا۔

ہندستان سے وہ سیدھے دولت عثمانیہ کے صدر مقام

قسطنطنیہ پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ترکی کے عروج کا دور ختم ہو کر زوال کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اُس کی پستی کا یہ حال تھا کہ وہ "یوروپ کا مردبیمار" (sick man of Europe) کا لقب پا چکا تھا۔ پھر بھی اُس کا اثاثہ اس قدر عظیم تھا کہ یوروپی اقوام بستر مرگ پر آس لگائے بیٹھی تھیں کہ جیسے ہی اِدھر اُس کی آنکھ بند ہوئی، اُدھر وہ اُس کی وراثت کے حقدار بن گئے۔ حصّے بخرے کرنے اور دولت عثمانیہ کو لوٹنے والے ایک نہیں کئی تھے۔ سب سے بڑا غاصب روس تھا جو اس تاک میں تھا کہ وہ شیر کا حصّہ ہڑپ کر جائے۔ سارا تُرکستان، تاجکستان، آذربائجان، کرغیظ و خفقاذ ہی نہیں بلکہ دردانیال ہوتے ہوئے بحر روم کے سرحدوں تک بھی قابض ہونے کا وہ مصمم ارادہ رکھتا تھا۔ انگلستان و فرانس اور اٹلی و جرمنی جیسے طاقتور و حریص رقیبوں کو یہ کب گوارا تھا۔ کہ سارا شکار کسی ایک کا لقمہ ہی بنے۔ لہٰذا رسّہ کشی آسمان تک پہنچ چکی تھی۔ اگر خارجی قوتوں کا یہ حال تھا تو اندرونی معاملات میں نظام حکومت طوائف الملوکی کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ مصر کبھی کا الگ ہو چکا تھا۔ عرب بغاوت پر تلے ہوئے تھے۔

مراقش، الجزائر، طرابلس، عراق، شام، ہر جگہ بغاوت کی آگ لگی ہوئی تھی۔ انیسویں صدی میں دولت عثمانیہ کا وہی حال تھا۔ جو اٹھارہویں صدی میں مغلیہ شہنشاہیت کا ہندستان میں رہا تھا۔

ایسے نازک وقت پر دھماکے سے افغانی استنبول پہنچ گئے۔ ان کی آمد کو غیبی تائید مانا گیا، اور فوراً اُن کو مجلس معارف کا رکن بنا دیا گیا۔ ان کی تشخیص و تجویز پر اگر عمل پذیرائی ہوتی تو مریض صحت یاب ہو جاتا۔ انھوں نے ایسا نسخہ سوچا جو تمام امراض مہلکہ کا واحد علاج تھا۔ پھر سے اسلامی روح پھونک کر سکتے کے مریض میں ہوش کے آثار نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ پھر سے اتحاد و اتفاق و وحدت کے نشتر سے دل کے بجھتے چراغ کو روشن کرنے کی کوشش کی۔ پھر سے توحید کا عرق گھول کر ٹھنڈی رگوں میں حرارت کا خون دوڑانے کی کوشش کی۔ یعنی سارے عالم اسلام کے اوراق پریشاں کی شیرازہ بندی کو دین محمدی کے تار سے مستحکم کرنا چاہا۔ اسلامی حمیت و خودداری و جوش کردار کو پھر سے اُجاگر کرنا چاہا۔ ماضی کے شاندار خوابوں کا سہارا لے کر اُن کی تعبیر کو پھر سے دہرانا چاہا۔ ایک ٹھوس آفاقی اسلامیت (Pan – Islamism) کا منصوبہ تراش کر ڈوبتی کشتی کو

طوفان سے بچانا چاہا۔ لیکن مریض کی کم ظرفی اتنی تھی کہ اِس علاج کو پسند نہ فرمایا۔ جب مریض ہی خودکشی پر تلے تو کوئی کیا کرے؟ جب خود بیمار یہ کہے "وقفۂ مرگ اب ضروری ہے:۔ عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم" تو کوئی کیا کرے؟ لہٰذا تنگ نظر، مفاد پرست، عیش پسند، غفلت شعار، ارکانِ دولت نے افغانی کے علمی، تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی و سیاسی نظریات کو رد کر دیا۔ ان کے مخالف بن گئے اور انھیں ترکی سے بھگا دیا۔

اب افغانی مصر تشریف لائے۔ یہاں حالات کچھ بہتر تھے، کچھ تو شعور تھا، کچھ تو عقل و تمیز تھی۔ ریاض پاشا نے ان کا استقبال کیا۔ خدیو کے قریب ہوتے گئے۔ ان کے خیالات افکار و جذبات کو سراہا گیا۔ عالم، فاضل، ادیب، دانشور اور سیاست دان سب مرعوب تھے کہ افغانی کے سینہ میں علوم کا کیا سمندر موجزن تھا، اُن کے ذہن میں خیالات کا کیا طوفان برپا تھا اور اُن کے دل میں آرزوؤں کا کیا سیلاب مضطرب تھا۔ حکومت کے مختلف شعبوں میں اصلاحات کی پذیرائی ہوئی، یہاں تک کہ جمہوریت کی داغ بیل ڈالنے کی بھی سوجھی۔ مجلس شوریٰ کی تجویز پیش کی جس سے عوام میں

خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔ آٹھ برس تک یہ جہاد جاری رہا۔ یہاں بھی انگریز گھبرا گیا ۔ خدیو اُن کے ہاتھ سے چھٹکارا پا جائے ۔ انھیں کب منظور تھا ؟ خدیو پر دباؤ ڈال کر افغانی کو مصر سے بھی بھگا دیا گیا ۔

اب وہ پیرس پہنچے ۔ یہ دنیا دِگرگوں تھی۔ یہاں انگریز کی دال نہ گلتی تھی۔ افغانی کا خیال تھا کہ جو کام افغانستان، ہندوستان، ترکی یا مصر میں نہ کر سکے وہ پیرس میں بیٹھ کر نوک قلم کے جادو سے انجام تک پہنچا ئیں گے۔ دنیا کا سب سے بڑا انقلاب، ذہنی انقلاب ہے۔ تغیر و تبدیلی، ندرتِ ذکر و فکر کی رہینِ منت ہے ۔ غار حرا کی تجلی ایک عالم کو منور کر چکی تھی۔ کیا تعجب کہ اُس شعلہ کی ایک شرر پھر سے عالم اسلام میں ایک تہلکہ مچا دے۔ اسی لیے انھوں نے پیرس میں آیۃ الکرسی کے مبارک پیغام "یُؤْمِنۡ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی" کا وِرد شروع کیا۔ (یعنی جس نے اللہ پر ایمان و ایقان رکھا اُس نے ایک بڑا اور مضبوط حلقہ تھام لیا) اِس آیۃ کریمہ کے" الفاظ چن کر" العروۃ الوثقٰی "کے مبارک نام سے ایک اخبار پیرس سے جاری کیا۔ جس کا معیار مولانا آزاد کے الہلال والبلاغ

کے برابر برابر تھا۔ مشرق کی تاریکیوں میں یہ بجلی کی طرح چمکتا رہا۔ لیکن بس ایک قلیل مدّت، صرف آٹھ مہینوں کے لیے ہی۔ افغانی کی شہرت اتنی بڑھی کہ شاہِ ایران نے انھیں دعوت دی، اور وہ ایران چلے آئے۔

آزاد مجاہد کی بے لوث و بیباک صداقت، اقتدار کے خود غرض کب پسند کرتے ہیں؟ اسلامی اخوت و مساوات و مروت بادشاہوں کو کب اچھی لگتی ہے؟ افغانی کو وزیر اعظم بنانے کی غرض سے دعوت تو دی گئی تھی لیکن شاہِ ایران کو جب یہ پتہ چلا کہ افغانی کا نظام فکر جمہوری اثرات سے لبریز ہے تو اس کے ہوش و حواس اڑ گئے، اور افغانی وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکل گئے ؎

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اب وہ خاقان چلے آئے۔ یہاں عزت افزائی ہوئی۔ سرائے فانی کے صرف چار سال باقی تھے، وہ یہاں کٹے۔ خاقان ترک کو اسلامی طرز حکومت کی صلاح دی اور اس نے قبول فرمائی جمہوریت اور شورائیت کے ذریعہ حکومت چلانے پر

وہ راضی ہوگیا۔ عمر کے آخری حصّہ میں عزت واحترام اور سکونِ قلب بھی نصیب ہوا، کم ازکم ایک خاقان کے دل پر اُن کی تعلیمات کا اثر پڑا۔ تاہم اُن کا مرکز محسوس خلافت کا نام لیوا و علمبردار سلطان عبدالحمید کا دارالخلافہ استنبول ہی رہا۔ جہاں وہ ۱۸۹۷ء میں جان بحق ہوئے۔ رحلت سے چند گھنٹے قبل اُن کی زبان بند ہو چکی تھی۔ انھوں نے اشارے سے کاغذ قلم مانگا، اور یہ لکھا کہ" اے اللہ تو گواہ ہے کہ رسول اکرمؐ رحلت سے پہلے " امتی، امتی" فرمارہے تھے، اور میں "ملّتی، ملّتی" پکار رہا ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے اُن کی روح قبض ہوئی۔ جو قلب مضطرب برسوں سے ملّت کی اصلاح کے لیے مرغِ بسمل کی طرح تڑپتا رہا، اب خاموش تھا ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
ایک جان کا زیاں ہے سوایسازیاں نہیں

یہ جلیل القدر انسان صرف ملّت کی خدمت کے لیے زندہ رہا۔ اس کا نہ کبھی اپنا گھر تھا، نہ مکان، نہ وطن، نہ شادی، نہ بیاہ اور نہ بچے۔ مشرق سے مغرب تک وہ گھومتا رہا تاکہ اسلام کا بول بالا ہو، ہم افغانی کی زندگی سے

کیا سیکھ سکتے ہیں؟ اولاً یہ کہ حق کی منادی آسان کھیل نہیں۔ ایثار و قربانی کا انبار چاہیئے۔ عزت و غیرت کی زندگی کے لیے مناسب قیمت چکانی ہوگی۔ دوم، ان کا نصب العین بہت بلند تھا۔ عوام الناس کی اصلاح، ارکانِ دولت کی اصلاح، عقل و نفس کی اصلاح، تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی و سیاسی شعبوں میں اسلامی نظامِ فکر کا اجرا، قرآن مجید کی بنیاد پر اجتماع، اسلامی ممالک کو مغرب کی غلامی سے نجات، ایک صالح نظامِ حکومت کا نفاذ، حیات ملّی و حیات ذہنی کی تلاش، حرکات، سکنات، خیالات میں انقلاب اور قرونِ اولیٰ کی چھڑ سے تجدید۔ سوم، اُنھوں نے ہمیں تین اہم خصائل کی ترغیب دی۔ وہ ہیں حیا، امانت اور صدق۔ یہی وہ بنیادی چیزیں ہیں۔ جن سے اخلاقی شخصیت تعمیر پاتی ہے اور صالح انسانی سماج تشکیل پاتا ہے۔ چہارم، قلب و روح کی غذا توحید ہے۔ یہ سارے امتیازات کو ڈھاتا ہے، انسان کے کمال اور وصف اور عمل کو تازیانہ بخشتا ہے، عقل و بصیرت کو اُجاگر کرتا ہے۔ اسلام نے دنیا کی وحدانیت و روشنی کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی ہے۔ پنجم، اسلامی عقاید

بہ نسبت دوسرے مذاہب کے بہت بہتر ہیں اور اُن پر
عمل آسان بھی ہے، یہاں غیر عقلی عقیدوں کا دخل نہیں۔
ششم، وہ سیاسی نظام حیات کی اصلاح بہت ضروری
سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سارے عالم اسلام میں ایسی
حکومت ہو جو قرآن کی بنیاد پر عمل پذیر ہو۔ یہ ضروری نہیں
کہ تمام عالم اسلام کا ایک ہی حاکم ہو، لیکن چاہتے تھے کہ
سب کا حاکم قرآن ہو۔ وہ سیاست کی راہ میں مسلمانوں کی
پستی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ مغربی سامراج کے خلاف
اعلان جنگ چاہتے تھے۔ اسلامی سیاسی فکر کے وہ مظہر تھے
اور چاہتے تھے کہ جوش کردار و حمیتِ اسلامی و غیرت و خودداری
سے پھر ایک مرتبہ وہ نقشہ اُبھر آئے جو ہمارے اسلاف نے
پیش کیا تھا۔ غرض یہ عظیم ہستی ملّت کی شیرازہ بندی کا عزم راسخ
لے کر وجود میں آئی تھی۔ اسی مقصد کے لیے وہ زندہ رہی
اور اُسی کے لیے اپنی جان دے دی۔

"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

مولانا محمد علی جوہر

صدیوں بعد جب جس ہستی میں عقل برہانی وعقل نورانی دونوں موجود ہوں، جس کی روح پاکیزگی و لطافت سے بھری ہوئی ہو، جس کا ضمیر وحدت کے نور سے روشن ہو جس کی فکر انسانیت کے اوج ثریا کا سراغ لگاتی ہو، جس کا قلب سلیم تازہ دولتِ عرفان کا متلاشی ہو، جس کا جی ملت اسلامیہ کی رفعت وعظمت کے لیے تڑپتا ہو، جس کا قلم قیامت خیز تہلکہ مچا سکتا ہو، جس کا نطق علم و حکمت کے موتی رولتا ہو اور جس کے جذبہ شوق میں، حمیت و ہمدردی میں، صداقت و اخلاص میں، صبر و استقلال میں، متانت و استدلال میں، سمندر کی گہرائی ہو، واقعی ایسی ہستی فیضان سماوی کی رحمت ہی ہوگی۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ایک ایسی جوہر نایاب ہستی، جس کا نام نامی محمد علی جوہر ہے۔

قدرت کی طرف سے ملت کو اُس وقت نصیب ہوئی جب کہ
شانِ اسلام کا ستارہ غروب ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔

مولانا محمد علی جوہر کے کارناموں کا اندازہ لگانے کے لیے اس وقت کا تاریخی پس منظر چاہیئے۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کہ فرعونی مغربی طاقتیں اپنے شباب پر تھیں۔ زندگی کے ہر میدان میں وہ آگے تھے۔ عالم اسلام ہر جگہ طوفانی تھپیڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ دولت عثمانی چکنا چور ہو رہی تھی۔ برصغیر ہند پر برطانوی پرچم بام عروج پر لہرا رہا تھا۔ سارا ہندستان غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔ مغربی مکر و فریب کی چال دیش کی سیاسی فضا زہریلی بنا چکی تھی۔ برادرانِ وطن ایک دوسرے سے کٹے ہوئے تھے۔ آپسی رسہ کشی اور فسادات سے زندگی اجیرن بن رہی تھی۔ خود ملت اسلامیہ باہمی اختلافات، تفرقات و خرافات کی وجہ سے قعرِ ذلت میں پھنس چکی تھی مسلمانوں کی حالت ہر لحاظ سے، چاہے علمی ہو یا اخلاقی، سیاسی ہو یا سماجی، تہذیبی ہو یا معاشی، ناگفتہ بہ تھی۔ کہیں ایسا ملاّح، ایسا رہنما، ایسا قائد نظر نہیں آتا تھا جو ڈوبتی کشتی کو ساحل سے لگائے

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ

"کرتا نہیں قصور ہمارے ہلاک میں ÷ یارب یہ آسمان بھی جل جائے خاک میں"
والی بات تھی۔ ایسے نازک وقت پر دھما کے سے مولانا کا ظہور
باعث رحمت بنا۔

کسی عظیم ہستی کی پرکھ تین باتوں سے ہوسکتی ہے،
اُس کے تلاش حق سے، اُس کے نیکی کے نقوش سے اور اُس
کے اوصاف حمیدہ سے۔ تلاش حق کے وہ معنی نہیں کہ الہٰیات
میں کھو کر کسی خانقاہ میں بیٹھ کر ذاتِ الہٰی وصفاتِ الہٰی میں
گم ہو جائے بلکہ وہ ہیں کہ کارزارِ علم وعمل میں اتر کر حق تلفیوں
اور ناانصافیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے، ظلم واستبداد کو نابود
کرے، حقوق اللہ وحقوق العباد کو نافذ کرے، اور ایک مردِ
مجاہد بن کر صالح زندگی کے لیے جان کی بازی لگا کر لڑے،
نیکی کے نقوش وہ نہیں کہ نام ونمود کی خاطر کچھ ایسے کام کرے
جو اخبارات کی سرخی بنیں، یا پتھروں پر اپنے چھوٹے موٹے
کام کندہ کروائیں بلکہ ایثار وقربانی کی وہ مثال قایم کرے
جو ہمیں حضرت امام حسین کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ فیاضی
اور دریا دلی ایسی ہو کہ حاتم طائی کی یاد تازہ ہو جائے ۔
ہمدردی وانسانیت ایسی ہو کہ انصار ومہاجرین کا نقشہ ذہن

میں ابھر آئے۔ حق و انصاف اور جذبہ خدمتِ خلق ایسا ہو جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں تھا۔

مولانا کی ساری زندگی بھی ایسی ہی تلاش حق و ایسے ہی نیکی کے نقوش سے بھری پڑی ہے جو تاریخ اسلام کے زرین زمانہ سے وابستہ ہیں۔ اُن کے اوصاف حمیدہ کا اگر ذکر آئے تو اُن کی حق گوئی و بیباکی، الوالعزمی و دوراندیشی، ہمّت و حوصلہ، صبر و شکر و غنا، محبّت و مروت، صفائی و سادگی، حمیت و ہمدردی، سبھی اُن کی رگ رگ میں پیوستہ تھیں۔ اخلاقی شخصیت کی بلندی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو اُن میں موجود نہ تھا۔

مولانا کی شخصیت کے بے شمار پہلو تھے۔ وہ بذاتہٖ ایک فرد نہیں تھے۔ بلکہ ایک انجمن تھے، جس میں صلاحیتوں کا ایک سمندر موجزن تھا۔ ایک ایسے ایڈیٹر جس کی جولانی قلم سے تہلکہ مچ جاتا تھا۔ ایک ایسے شاعر جس کا کلام روح کو تڑپا دیتا ہے۔ ایک ایسے لیڈر جس کی قیادت سے دیش کی خلقت بھائی بھائی بن گئی تھی۔ حریت و آزادی کے ایسے جانباز سپاہی جن کی شجاعت و بہادری سے حریفوں

کے دل دہل جاتے تھے۔ مگر سب سے بڑھ کر ملتِ اسلامیہ کے ایسے عاشق کہ اُن کی اِس وارفتگی پر فرہاد وقیس بھی قربان۔ اُن کی زندگی کے بے شمار پہلوؤں میں سب سے اہم پہلو یہی تھا۔ کامریڈ و ہمدرد کا اثر ایسا تھا جیسے کہنی کی ہڈی پر چوٹ۔ لوگ تلملا جاتے تھے۔ اخبار چوبیس گھنٹوں کی زندگی لاتا ہے اور بعد میں یا تو کسی فائیل میں دفن ہو جاتا ہے یا ردّی کی ٹوکری میں پہنچ جاتا ہے۔ سیاسی لیڈروں کا بھی یہی حال ہے "یہ عزت دولت، آنی جانی ہے۔ مل مل جائے چھن چھن جاتے" خلافت کی تحریک دو چار سال سے زیادہ چل نہ سکی۔ ایک طوفان آیا۔ اور بہہ کر چلا گیا۔ گاندھی جی کی رفاقت اور کانگریس کی صدارت بھی دھوپ چھاؤں سے بڑھ کر ثابت نہ ہوتی۔ مگر مولانا کی ذہانت و فراست کا خزانہ، اُن کا علم وفضل، اُن کی شاعری، اُن کی فکر، اُن کی تحریر، اُن کی تقریر، اُن کے خطبے، اُن کے اخلاق، ایسی لازوال قدریں تھیں جنھوں نے اُنھیں حیات جاوداں بخشی ہے۔

اِن سب پر سبقت لے جانے والا، جذبہ حُبِّ اسلام تھا۔ ایمان کی حرارت اُن کے ریشہ ریشہ میں بھری ہوئی تھی۔

ان کی ہر سانس میں توحید رس بس گئی تھی (توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے)، عاشقِ رسول ایسے کہ حضرت ابو بکر صدیق کی یاد تازہ ہو جاتے ہے

بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

عالم اسلام کے ایسے شیدائی کہ خلافت کے لیے جان دینے کے لیے تیار رہے

بولی اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پر دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا — کلمہ پڑھ کر خلافت پر مرنا
ہوتے میرے اگر سات بیٹے — کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
حشر میں حشر برپا کروں گی — پیش حق تم کو لے کر چلوں گی

قرونِ اولیٰ کے بعد توحید کا ایسا پرستار، رسولِ عربیؐ کا ایسا عاشق اسلام کا ایسا دلدادہ، ایمان کا ایسا پختہ کار، احسان کا ایسا حامل، ملّتِ اسلامیہ کا ایسا شیدائی اور عالم اسلام کا ایسا مجاہد شاید ہی پیدا ہوا ہو۔ جب ترکوں کو یونان پر فتح نصیب ہوئی تو وہ پکار اٹھا ہے

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی — سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی

اس وقت مولانا بے جا پور کی جیل میں مقید تھے۔ مسلمانوں کی بے بسی کو دور کرنے آیتہ کریمہ کا سہارا لے کر کہتے ہیں ؎

تو طیر ابابیل سے ہر گز نہیں کم بے چارگی پہ اپنی نہ جا، شانِ خدا دیکھ

غرض مولانا نے صرف ایڈیٹر، لیڈر کی حیثیت سے ہی انسانیت پر رحم و کرم نہیں فرمایا، بلکہ ایک مردِ مجاہد و مردِ کامل کی حیثیت سے بھی، ایک مبلغ اسلام کی حیثیت سے بھی اور ایک پیشوائے ملت کی حیثیت سے بھی۔

مولانا کی سخت مذہبیت و ایمانیت ان کے ہر فعل و قول سے واضح ہے۔ لکھا ہے " کلام پاک ریشم کی جزدانوں اور الماری کے بالاتر حصوں اور وہاں کے گرد و غبار کے لیے آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کا ہر نسخہ اس کثرت سے مستعمل ہو کر پنسل کے نشان، کاغذ کی پٹیاں بین الاوراق، یہاں تک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشان ہر جگہ نظر آئیں اور ثابت کر دیں کہ اس کتاب سے زیادہ اسلام کے ماننے والے کسی کتاب کو نہیں پڑھتے، نہ اس سے زیادہ کسی کتاب کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں "۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ جو ہمارے ادب کا شاہکار ہے، احکام خداوندی وارشاداتِ نبویؐ

نبوی سے ہی منسلک ہے۔

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنّت کی فضا دیکھ
یہ نور خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا
کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ، تو بھی بجھا دیکھ
سونے کا نہیں وقت یہ ہشیار ہو غافل
رنگِ فلک پیر، زمانہ کی ہوا دیکھ
ہو حسن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا دیکھ

مولانا کی ساری زندگی حمایت اسلام میں کٹی۔ مئی ۱۹۱۳ء میں جب کانپور کی مسجد کے ایک حصّہ کو سڑک کی توسیع کے لیے ڈھا دیا گیا تو مولانا نے حاکم اعلا سر جیمس مسٹن کی ایسی خبر لی کہ وہ حیران و پریشان ہو گیا۔ یہی مسٹن چند دن قبل مولانا کا یار غار تھا۔ بلقان کی جنگ میں ہمدردی ترکیوں کے ساتھ اس قدر بڑھ چڑھ کر تھی کہ سارا یوروپ خوف زدہ تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑی تو مولانا نے کامریڈ میں ایک مقالہ لکھا جو لندن ٹائمز میں بھی چھپا۔ یہ ایسا بم تھا جس کے دھماکے سے ڈر کر کامریڈ کو موقوف اور

مولانا کو نظر بند کر دیا۔ پہلے مہرولی، بعد میں نجیب آباد، پھر
چھنڈواڑہ جیل میں برسوں نظر بند رہے۔ لیکن چھنڈواڑہ جس کا
نام لوگوں نے سنا بھی نہ تھا، عوام کا زیارت گاہ بن گیا۔ یوسف
نہ ہوتے تو کنعان کو کون یاد کرتا؟ مولانا نہ ہوتے تو چھنڈواڑہ
کو کون جانتا؟ محمد علی و شوکت علی زندہ پیر بن گئے۔ کامریڈ کا
ایڈیٹر، شکسپیر کے ڈراموں کا ناقد و شارح، اب دین کا مبلغ و
داعی بن چکا تھا۔ روئے سخن صرف خدا اور اس کے رسول کی
طرف تھا۔ ایمان کی مضبوطی میں رقمطراز ہیں :۔

"بھائی، جتنی شاعری چاہو، باہر کی عورت
پر صرف کرو اور اُسے لبھاؤ اور رام کرو۔ مگر
گھر کی بیوی تمھاری ہے، نہ دوسرے پر نظر
ڈال سکتی ہے نہ اُس کو تمھاری گریہ وزاری اور
التماس و گزارش کی ضرورت...... خدا نے ہم
پر بڑا رحم فرمایا جو مسلمان کے گھر پیدا کیا۔"

چھنڈواڑہ سے چند دن کی رہائی پر رامپور جاتے ہوئے لکھنؤ
میں چند منٹ رکے تو وہاں معتقدوں کا جم غفیر تھا، آپ نے
جو خواہش کی وہ یہ تھی کہ کوئی سورۂ بقرہ کا پندرہواں رکوع

خوش الحانی سے پڑھے۔ جب یہ پڑھا گیا تو آپ کو وجد آگیا۔ روتے تھے اور ہاتھ پیر پٹختے تھے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں جنگ کے خاتمہ پر رہائی ملی۔ اب قلم کے بجائے زبان سے تبلیغ کرتے تھے۔ دین کی مستی و دیوانگی دُنیا کی ہر شئے پر غالب آچکی تھی۔ عشقِ حقیقی میں مست رہتے۔ شاعرانہ مزاج کے ناتے ذوقِ نظارۂ جمال و شوقِ دیدۂ جلال کا ولولہ دل و دماغ پر عجیب کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔ فرماتے ہیں۔

کچھ بھی وہاں نہ خنجرِ قاتل کا بس چلا
روحِ شہید رہتی ہے نعش و کفن سے دور
آسان نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا
تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور
مسلم اجل سے دُور نہیں روزِ کربلا
رہتا نہیں برات میں دولھا دلہن سے دور
ہے کس کے بل پہ حضرتِ جوہر یہ روکشی
ڈھونڈھیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد

ایک لحاظ سے نظربندی کا زمانہ ایک طویل تعطیل تھی جب کہ دنیا و ما فیہا سے الگ وہ اپنی فطری ذہنی قوتوں کو جِلا دے کر ادب

کی شکل میں ڈھال رہے تھے اور عالم تنہائی میں تخیلی آنکھوں سے
نور احمدی کا نظارہ کر رہے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

تنہائی کے سب دن تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر لحظہ تشفی ہے، ہر آن تسلّی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی، ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

مولانا کی زندگی میں دین اور دُنیا دونوں کا برابر حصّہ رہا ہے۔
گو کہ دین کا پلّہ کچھ تھوڑا بھاری ہی تھا۔ صحیح اسلامی نقطۂ نظر
سے دین و دنیا کو انھوں نے الگ الگ حصّوں میں نہیں بانٹا
تھا۔ لیکن دنیاوی ہر امر میں ہمیشہ آخرت کے توشے کا خیال
رہا۔ پھر بھی ان کی دُنیوی زندگی کو اگر دیکھا جائے تو اس میں
چار منزلیں نظر آتی ہیں۔ پہلا دور بچپن سے ۱۹۱۲ء تک،
دوسرا ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۹ء تک، تیسرا ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۴ء

تک اور آخری ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۰ء تک۔
پہلے دور میں ایک ذکی، ذہین، شوخ، ظریف، خوش مزاج، ولولہ خیز نوجوان، زندگی کی سبھی راحتیں، لذتیں و مسرتیں لوٹنے کا شوقین، شاعر مزاج، بذلہ سنج، غضب کا مقرر، علی گڑھ کا گریجویٹ، آکسفورڈ کا آنرز، انگریزی زبان کا ماہر، شکسپیئر کا شارح و نقاد، مغربی تہذیب کا دلدادہ، سوٹ بوٹ میں ملبوس رکھ رکھاؤ، بول چال، رہن سہن میں مغربی طرز، ٹھیٹ علی گڑھ مکتبہ خیال کا حامی، حکام اعلا کا گہرا دوست، حتیٰ کہ وائسرائے سے بھی آشنائی، مغربی علوم سے مرعوب، یورپ کے خیالات، ایجادات، فتوحات، کمالات و حکمت عملی کا مداح، غرض انگریزی تہذیب کا لہلہاتا پودا، اور اُن کی پالیسی کا ایک بہترین پھل۔
پھر کامریڈ کا ایڈیٹر جس کی وجہ سے سارے عالم کا "مرکز محسوس" بن گیا۔ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم ہو یا کنگ جارج پنجم، کامریڈ اخبار کے ایسے مشتاق و منتظر گویا ان کے محبوب کے آنے میں دیر لگ رہی ہے۔ اس کے دیدار کے بغیر اُن کی عید نہیں ہوتی تھی۔
پھر ہمدرد نکلا تو وہی شان، وہی آن، وہی عزت، وہی وقعت، کہ پڑھنے والوں کا دل بلیوں اچھلتا تھا۔ مسرت کی لہریں دل

یں چٹکیاں لیتی تھیں کہ مالک نے کیا غضب کا علمی خزانہ ہمدرد کے خالق کے قلب میں بھر دیا ہے۔

یہ سب پہلے دور کا قصّہ ہے۔ بلقان کی جنگ چھڑی۔ بعد میں جنگ عظیم۔ مولانا کا ملّی جذبہ اُبھرنے لگا۔ فرعونی طاقتوں کو سمجھنے لگے۔ اُن کی عیاری، اُن کی سفاکی، اُن کے غمزے، اُن کے نخرے اور اُن کے پنج خونیں کا کچھ تو اندازہ ہونے لگا۔ گدھ کی طرح دولت عثمانیہ پر اُن کی جھپٹ نے مولانا کے حساس دل میں مغرب کے خلاف ایک نئی آگ لگا دی اور یہ آگ اُن کے آخری دم تک سلگتی رہی۔ کامریڈ میں اُنھیں آڑے ہاتھوں لیا۔ دوست دشمن بن گئے۔ موسٰی فرعون کے گھر سے نکل چکا تھا، وہ اب اپنے قبیل کے بچاؤ میں لگا تھا۔ اب اس کی زندگی کا ہر لمحہ، ہر آن و ہر سانس اِنھیں مغربی سامراجی طاقتوں کو کچلنے کی تدابیر میں مصروف تھا اور اس جدوجہد میں انھوں نے بالآخر جان بھی دے دی۔

مولانا کی صحیح ملّی و ملکی و قومی جذبہ و کارنامہ بلقان کی جنگ سے شروع ہوتا ہے۔ قید کے پانچ سالوں (۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک) میں دماغ میں ایک ہیجان برپا ہوا۔ اُن کی آنکھ

کھل گئی کہ جس کو وہ امرت سمجھ رہے تھے وہ زہر ہلاہل نکلا — تاریخ اسلام کے کسی دور میں بھی مسلمانوں کو ایسی سخت آزمائش سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ مشرق کا سب سے بڑا دشمن مغرب ہے۔ اسلام کا سب سے بڑا حریف صلیب ہے۔ مسلمانوں کے خون کے سب سے زیادہ پیاسے صیہونی ہیں۔ قرون وسطیٰ کی صلیبی جنگ کا پھر سے آغاز ہے۔ یہ جنگ کئی محاذ پر لڑی جارہی ہے، سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی، حتیٰ کہ علمی و تعلیمی میدان میں بھی۔ مولانا نے آکسفورڈ میں مارگولیتھ سے عربی پڑھی، لیکن بعد میں مولانا نے اس کو لعین و ملعون کہا۔ وہ اس لیے کہ میور نے جو کچھ اسلام کے خلاف لکھا۔ اس نے سرسید جیسے آدمی کو چراغ پا کر دیا تھا اور خطبات احمدیہ میں جواب دینے پر مجبور کیا تھا، لیکن مارگولیتھ نے جو کچھ لکھا وہ میور کے زہر سے کئی گنا زیادہ زہریلا تھا۔ اس لیے پھر سے صلاح الدین ایوبی کی ضرورت تھی۔ مولانا کے طوفان خیز ذہن میں تاریخ اسلام کا گراموفون پھر سے گھومنے لگا۔ اسی ذہنی کوفت کے زمانے میں سلاخوں کے اندر کے قیدی کو کچھ فرصت اگر ملی تو وہ اس کو اپنی شاعری سے ملی جس میں حسن ربانی کی جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔

تیسرے دور کا آغاز ۱۹۱۹ء سے ہوتا ہے۔ جب کہ قید سے رہائی ملی۔ یہ چار یا پانچ سال کا دور اُن کا زرین زمانہ ہے۔ اُن کا ستارہ اب بام عروج پر تھا۔ وہ صلاح الدین ایوبی کے صحیح رنگ میں نمودار ہوئے۔ کارزار حق و باطل میں سینہ سپر دکیے ہوئے ہر جگہ فرعونی طاقتوں کے خلاف محاذ کھڑے کرتے رہے۔ یہاں ملک کا مفاد تھا، ملت کا مفاد تھا، قوم کا مفاد تھا، عزت، آبرو غیرت کا سوال تھا، آزادی کا سوال تھا۔ اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو حرم کے پاسبانوں کو بھی مدد ملے گی، بیت المقدس کے رکھوالوں کو بھی اور عالم اسلام کے حریت پسندوں کو بھی۔ عربوں کا بھی فائدہ تھا، ترکوں کا بھی، افغانوں کا بھی اور ایرانیوں کا بھی۔

یہاں ایک اور سوال اہم تھا۔ برادرانِ وطن ملت اسلامیہ سے کچھ بگڑے ہوئے تھے، کچھ رنجش اور خلش تھی۔ اس لیے کہ مسلمان کانگریس سے الگ تھلگ رہے تھے جس کی وجہ ایک گونہ بدگمانی پیدا ہو چکی تھی کہ مسلمان ملک کی آزادی میں حائل ہیں۔ بھائی بھائی میں تفرقہ تھا۔ غیر ملکی مفاد تفرقوں کو مزید ہوا دے رہے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے بیج بو

رہے تھے۔ خلافت کا احسان، مولانا کا احسان، اور گاندھی
جی کا احسان کہ رنجشیں دور ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے۔
مولانا کی قیادت میں پھر بھائی بھائی شیر وشکر بن گئے۔ مولانا
کانگریس میں کیا گھسے، ساری ملت اسلامیہ کانگریس کے پلیٹ
میں آ گئی۔ مولانا و مہاتما کی تفریق مٹنے لگی۔ ہندو مسلمان ایک
ہونے لگے۔ دیش کے سبھی باشی ایک اکائی بن گئے، ایک پرچم
کے تلے جم گئے اور ایک ہی دھن میں لگ گئے کہ سوراج لے کر
ہی دم لیں گے۔ اتحاد و اتفاق کا بے نظیر منظر ہر جگہ نظر آنے
لگا۔ گاندھی جی کا ستیہ گرہ سے ہندستان کی آزادی مقصود
تھی تو مولانا کی تحریک خلافت سے عالم اسلام میں حریت و غیرت
و خودداری۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مغرب کے پاؤں ہر جگہ سے اکھڑنے
ہی والے ہیں۔ ہندستان میں وہ جوش وخروش، وہ ولولہ و
ہنگامہ کہ ہر جگہ انقلاب، انقلاب کی پکار۔ ادنا اعلا، عالم جاہل،
ہندو مسلم سبھی آزادی کے نشہ میں چور چور نظر آ رہے تھے۔ کشمیر
سے کنیا کماری تک، بلوچستان سے بنگال تک مولانا و مہاتما جوش
ابھارتے پھر رہے تھے۔ ہر جگہ میلہ لگ جاتا تھا، اللہ و اکبر کا نعرہ
ہندو مسلمان مل کر لگا دیتے تھے۔ مولانا کی تقریر سے دل دہل جاتے

تھے اور وجدان کا سماں بن جاتا تھا۔ مغربی لباس نظر آتش کیا جاتا تھا۔ بدیشی مال کے بائیکاٹ پر لوگوں کو اُکسایا جاتا تھا۔ وکلا و عدالت کو خیرباد کہہ رہے تھے۔ ہر شخص ہر قربانی کے لیے تیار تھا اور اس میں ہندو مسلمان میں تفریق نہ تھی۔ انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کیا جارہا تھا اور قومی ادارے وجود میں آرہے تھے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وجود بھی اسی جوش کا ایک مظہر ہے۔ سرسید نے علی گڑھ کالج کی بنا ڈالی تو مولانا نے جامعہ ملیہ کی۔ سرسید مغرب کے حامی نظر آرہے تھے تو مولانا مغرب کے باغی۔ سرسید نے مغربی علوم کو آسمان پر چڑھایا تو مولانا نے مشرقی علوم کو۔ سرسید نے اپنی ملت کے افراد کو کمشنر، کلکٹر و جج بنانا چاہا تو مولانا نے اُن کو مومن، مسلمان اور نیک انسان۔ سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رہنے کی ترغیب دی تو مولانا نے کانگریس میں ضم ہونے کی۔ مولانا جامعہ ملیہ کے روح و رواں بن گئے۔ اُس کے بنانے میں کن دشوار گھاٹیوں سے گزرنا پڑا، وہ اب تاریخ کے صفحوں میں محفوظ ہے۔ مولانا خود تاریخ اسلام پڑھاتے تھے اور ایسا پڑھاتے تھے کہ رقّت طاری ہوجاتی تھی۔

یہ طوفان خیز سلسلہ تا دیر نہ چل سکا۔ کچھ اپنی لغزشوں

سے اور کچھ جابرانہ حکومت کے ظلم و ستم سے ہماری تاریخ کے صفحات فوری فتح و نصرت کا مژدہ نہ سنا سکے۔ فرعونی طاقتیں روحانی قوتوں پر کبھی کبھی غالب آجاتی ہیں۔ انگریزوں کے پاس توپ، گولہ، بارود اور جیل خانے تھے۔ ان کا فراخ دلی سے استعمال کیا گیا۔ ان گنت نوجوان شہید ہوئے، ہزاروں جیل خانوں کی ہوا کھاتے رہے، لاکھوں کروڑوں کا مالی نقصان سہتے رہے۔ بے گناہ عورتیں بیوہ ہوئیں۔ بہت سے معصوم بچے یتیم بنے۔ جلیانوالہ باغ شہیدوں کے خون سے رنگا گیا۔ ظلم و ستم، جبر و استبداد کا دور تھا۔ جابر حکمران تحریک آزادی کو کچل رہے تھے۔ لیکن ہماری بھی تھوڑی سی ایسی لغزش تھی جس نے سلگتی آگ کو سرد کر دیا۔ مہاتما کا یہ فیصلہ کہ چورا چوری کے حادثہ سے اُن کے ضمیر کو دھکا لگا ہے، اس لیے ستیہ گرہ کو فوراً سے موقوف کر دیا جائے، ایک ایسا فیصلہ تھا کہ عوام کا سارا جوش ختم ہو گیا۔ خلافت کی تحریک بھی ٹھنڈی پڑ گئی۔ چونکہ ترکی کے مصطفےٰ کمال پاشا مغربی تہذیب کے دلدادہ بن گئے تھے۔ جب سارے لیڈر جیل بھیج دیے گئے، جب عوام کا جذبہ گاندھی جی کے فیصلہ سے سرد پڑ گیا اور جب

خلافت کی جڑ کاٹ دی گئی تو مولانا کے تیسرے اہم سنہرے دَور کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

آخری اور چوتھا دور جو پانچ یا چھے سال کا تھا، بڑا ہی مایوس کن اور تکلیف دہ ہے۔ کانگریس میں پھوٹ، سوراج پارٹی کا اجرا، ہندو مسلم فسادات، مہاسبھا کا غلبہ، اُردو ہندی کا جھگڑا، شدھی و سنگھٹن کی تحریک ہندوؤں کی طرف سے اور تنظیم و تبلیغ کی مسلمانوں کی طرف سے، نہرو رپورٹ، جناح کے چودہ نکات، مسلمانوں کے آپسی تفرقے، گاندھی جی کی سیاسی پالیسی میں تبدیلی و انگریزوں کی حکمت عملی سب نے مل کر مولانا کے سنہرے خواب کو حقیقت نہ بننے دیا۔ فوج کے بغیر تنہا سپاہی کیا کرسکتا ہے؟ وہ آخری عمر تک اپنے اصولوں پر ڈٹے رہے۔ مشیت ایزدی کچھ دگرگوں تھی۔ ان کی دلی خواہش پوری ہوئی مگر وہ دعا مقبول ہوتی کہ اُن کے جسدِ خاکی کو ایسی جگہ آرام ملے، جہاں سے نورِ احد کی تابناک شعاعیں سارے عالم کو منور کر چکی تھیں۔ وہ اب وہاں استراحت فرما رہے ہیں۔ جہاں سے سرورِ کائناتؐ نے معراج کا شرف حاصل کیا تھا۔ خداوند کریم مولانا کے مرقد کو نور سے بھر دے، آمین۔

آخر میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ہم مولانا کی زندگی سے کیا سبق سیکھ سکتے ہیں؟ پہلا یہ کہ انسان میں دانش برہانی و دانش روحانی دونوں چاہیئے۔ یہ دونوں خوبیاں مولانا میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ دانش برہانی وہ ہے جس سے انسان چاند پر قدم رکھ سکتا ہے۔ عناصر پر حکومت کر سکتا ہے، حیرت انگیز تجربات سے کائنات کو مسخر کر سکتا ہے، لیکن دانش روحانی وہ وجدانی و روحانی عقل ہے جس کا مقام عشق ہے اور نیابت الٰہی۔ اس سے بڑی معراج کا قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں روح کی پاکیزگی ہے اور دل کی صفائی جس میں حسن ازل جھلکتا ہے۔ مولانا ہمیشہ ایسی پاکیزگی و صفائی کے خواہاں تھے۔ دوسرا یہ کہ اگر نفس مطمئنہ چاہو تو نفس امارہ کو مارو۔ "نفی ہستی ایک کرشمہ ہے دل آگاہ کا ؎ لا کے دریا میں نہاں ہے موتی الاّ اللہ کا"۔ مولانا ہمیشہ اپنے نفس کو مارتے رہے۔ وہ چاہتے تو دنیا کے سارے عیش ان کے قدموں کے نیچے ہوتے۔ ملک و ملّت کے لیے جو سختی انھوں نے سہی اور جو جو ایثار و قربانی اُنھوں نے کیں، وہ آب زر میں لکھنے کے قابل ہیں۔ آنھوں نے ہمیں یہ بتایا "عشرت قطرہ ہے دریا میں

فنا ہو جانا" فرد ملّت میں ضم نہ ہو تو قطرۂ شبنم کی طرح فنا ہو جائے گا۔ تیسرا یہ کہ ایک سچے مومن مسلمان کے دل میں حُبِّ اسلام و حُبِّ وطن دونوں بیک وقت سما سکتے ہیں۔ مولانا کا دینی جذبہ تو خیر اظہر من الشمس ہے، لیکن وطن کی آزادی، وطن کی خیر خواہی اور وطن کی فلاح کے لیے آنھوں نے جو کچھ کیا ہے اُس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ چوتھا یہ کہ" بزم ہستی میں ضروری ہے کوئی روحِ رواں" انسانی تہذیب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ قدرت نور کا ایک تڑکا ظلمت میں نہ چمکا دے۔ جہالت انتہا کو پہنچ جاتی تھی تو انبیاء اولیاؔ کا ظہور ہوتا تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی فرعونی طاقتوں کا اتنا غلبہ تھا کہ ایک نئے موسیٰ کی ضرورت پڑی۔ مولانا کی رحلت کے صرف سترہ سال بعد ہندستان آزاد ہوا۔ آزادی پانے والے اور جشن منانے والے کیا جانیں" لہو اِس خاک پر کن کن عزیزوں کا گرا ہوگا" پانچواں یہ کہ" من کی دنیا ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں۔ تن کی دُنیا چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن" مولانا کا ذوق لطیف، خیال بلند اور ضمیر پاک وہ کبھی مال و دولت کے پیچھے نہ رہے۔ وہ جانتے تھے

کہ "حسن رخسار دمے ہست و دمے نیست ۔ حُسن کردار و خیالات خوشاں چیزے است"۔ اُن کے حُسن کردار و خیالات بلندی کے ذکر کے لیے دفتر کے دفتر چاہئیں۔ ان میں وہ جلال و جمال و کمال تھا۔ جو ایک انسانِ کامل میں ہونا چاہیئے اور ہمیں بھی چاہیئے کہ ان کے کردار کی پیروی کریں۔ "صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر ۔ جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز"۔ چھٹا اور سب سے اہم سبق یہ کہ وحدہٗ لاشریک پر یقین کامل و ایمان راسخ سے ہی ہم سرخرو ہو سکتے ہیں۔ خوف و خطر سے گزرنے کا واحد وسیلہ حق الیقین ہے۔ ہر رنگ میں راضی و رضا رہنا زندگی کا جام پینا ہے۔" ہر ذرہ شہید کبریائی ہے ۔ اس کبریائی کی شان وحدت ہے۔ اس وحدت کی جھلک پانا نور بصیرت ہے۔ اس نور سے روح کو روشن کرنا اور ذہن کو منور کرنا عالم دانا کا کام ہے۔ مولانا کا یہی پیشہ تھا اور یہی اُن کا پیغام ہے

"کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے"

حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کا پیغام

اِس برصغیر پر کئی تاجدار آئے اور گئے۔ لیکن جو عظمت حضرت سلطان شہیدؒ کو نصیب ہوئی وہ کسی کے حق میں نہ آئی۔ وہ اِس لیے کہ انھوں نے راہ حق میں اپنے جان کی بازی لگادی۔ وطن کی بقا کے لیے تاج و تخت کو پائے حقارت سے ٹھکرایا۔ فرعونی طاقتوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے خاک وطن پر اپنا مقدس خون بہا دیا۔ حب الوطنی، شجاعت وحق وصداقت کا وہ نمونہ پیش کیا کہ رہتی دنیا تک ان کا نام نامی آفتاب جہاں تاب کی طرح روشن رہا۔ یہی نہیں بلکہ اختراع، تنظیم، تجدید، تجرید، فرض شناسی و رعایاپروری کی وہ بے نظیر مثال قایم کی جس سے ان کا ملک فردوس بریں کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ انھوں نے بداخلاقیوں کو دور کیا، غلط رواجوں کو مٹایا، قانون کا احترام

سکھایا، حریت کا سبق پڑھایا، نظامِ حکومت میں انقلاب برپا کیا، تجارت، زراعت، صنعت وحرفت، وزندگی کے ہر شعبہ کو فروغ دیا۔ سب سے بڑھ کر اخوت ومروت والنسانیت کا وہ پیغام دیا جو ختم الرسلؐ مولائے کلؐ کی تبلیغ سے وابستہ تھا۔

اِس مضمون میں ایک ہلکی سی روشنی اِس بات پر ڈالی جارہی ہے کہ حالاتِ حاضرہ کے مدنظر سلطان شہید کی زندگی سے ہم کیا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ زندگی اہم نہیں۔ اصول اہم ہیں۔ کسی خاص مقصد کے لیے جینا اور اُسی مقصد کے لیے مرنا عین زندگی ہے۔ سلطان نے غلامی پر موت کو ترجیح دی۔ زندگی آزادی کا دوسرا نام ہے۔ اور غلامی موت کا دوسرا نام۔ جب تک انسان اپنے مقصد کے حصول میں والہانہ انداز میں موت سے ہم آغوش نہیں ہوتا، اُس کا نام عاشقوں کی فہرست میں درج نہیں ہوسکتا۔ فرہاد وقیس کا بھی کچھ مقصد تھا جو آج مثالی بن چکا ہے اور جس کی وجہ ہی اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ سلطان کے نزدیک آزادی کا ایک لمحہ حیاتِ جاویدانی سے بہتر تھا۔ اِسی لیے اُنھوں نے وہ لمحہ اپنی جان دے کر

خریدا - اِسی وجہ سے آج دنیا میں ان کا نام سورج و چاند سے بھی زیادہ روشن ہے اور اُن کے قبر کی مٹی کروڑہا زندہ نفوس کی زندگی سے زیادہ تابناک ہے۔ اختر شیرانی نے بھی اِس نکتہ کو خوب سمجھا۔

"عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی میرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

ہم لوگ کو اب یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں، آزادی کے معنے صرف سیاسی آزادی ہی نہیں، بلکہ سماجی آزادی، اقتصادی آزادی، تہذیبی و تمدنی آزادی، افلاس و بھوک سے آزادی، غربت و نکبت سے آزادی، بے روزگاری و بے علمی سے آزادی، تعصب و تنگ نظری سے آزادی، فتنہ و فساد سے آزادی، اسرافات و خرافات سے آزادی، جہالت و خصامت سے آزادی وغیرہ وغیرہ، ابھی ہمیں کہاں نصیب ہوئی ہیں؟ ساری زندگی ایک کشمکش ہے جس میں ایک آزادی کے حصول کے بعد دوسری آزادی بھی منھ تکتے کھڑے رہے

گی کہ مجھ کو بھی حاصل کراؤ۔ جب تک انسان زندگی کے لیے ہر قسم کی آزادیاں حاصل نہ ہوں، سلطان شہید کی جہاد کا جواز باقی رہے گا۔

دوسرا اہم سبق یہ ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے تنظیم، تدبیر، تفکر، تدبر بالکل ضروری ہیں۔ سلطان نے اپنی سترہ سالہ قلیل دورِ حکومت میں اس تنظیم و تدبیر سے ملک کی حالت ایسے بدلی تھی کہ اغیار تک اُن کی دانشوری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ اُنھیں کا حریف، اُنھیں کے خلاف رزم و پیکار میں ملوث، اور خون کا پیاسا، میجر مور رقمطراز ہے:۔
" جب آپ اجنبی ملک سے گزر رہے ہوں، اور دیکھیں کہ زراعت ترقی پر ہے، شہر آباد ہیں، صنعت و حرفت کو ترقی ہو رہی ہے، تجارت فروغ پر ہے اور ہر گام پر ترقی یہ ظاہر کر رہی ہو کہ رعایا خوش حال ہے تو سمجھ لو کہ حکومت عوام کے مرضی کے مطابق ہے۔ یہ ہے ٹیپو کی حکومت کا نقشہ۔" یہ صورتِ حال اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ حکمران اپنے یا اپنے خاندان کے بیے نہیں، مادی منافع اور جاہ و حشمت کے لیے نہیں، بلکہ قوم اور عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے حکمرانی کرے ــــ یہ

صورتِ حال تفکر و تدبر سے ابھرتا ہے، سعی و کوشش سے پھلتا پھولتا ہے، ضمیر پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف سے پروان چڑھتا ہے۔ یہ سارے اوصاف سلطان میں موجود تھے۔ جو انھوں نے ہمیں ترکے میں چھوڑے ہیں۔

تیسری اہم بات اُن کی ندرت و جدت، ایجاد و اختراع ہے۔ اُن کا ذہن تخلیق کا سرچشمہ تھا۔ اُن کا دماغ تغیر کا آماجگاہ تھا، اُن کا شعور انقلاب کا منبع تھا۔ اُن میں پروانے کا سوز، ہرن کی دوڑ، بجلی کی چمک، مچھلی کی تڑپ اور چیونٹی کا انہماک موجود تھا۔ وہ ایک نئے دَور کے آغاز کے محرک تھے۔ نظامِ کہن کی ہر فرسودہ چیز سے انھیں نفرت تھی۔ اُس کو مٹا کر ایک صالح نظام کا قیام اُن کا مقصد تھا۔ اُن کی زندگی کا مسلک انقلاب تھا۔ نظامِ حکومت میں انقلاب، معاشی، تجارتی، زراعتی و صنعتی شعبوں میں انقلاب، تفکر، تدبر، تنظیم و رزم و پیکار میں انقلاب، عادات، حرکات، و سکنات میں انقلاب، رہن سہن و بود و باش میں انقلاب، غرض زندگی کے ہر شعبے میں وہ انقلاب چاہتے تھے۔ اسی لیے شہروں کے نام تک بدل ڈالے۔ ہندستانی کوس، وزن

کے باٹ، پیمانے کے آلے سارے بدل ڈالے۔ ہجری کے بجائے مولودی قایم کی۔ مہینوں اور سالوں کے نام عربی میں منتقل کر دیے، ہندسے لکھنے کا طریقہ بدل ڈیا۔ ایک نئ تقویم اجرا کی۔ تعمیر میں انتہائی کمال کر دکھایا، چند امراض کے نئے نسخے سوچے۔ اُن کی علم پسندی و علم پروری کا یہ عالم تھا کہ ایک نئی یونیورسٹی کا قیام سوچا۔ اس کا نام جامع الامور رکھا، جس میں دینی علوم کے علاوہ عصری علوم بھی تجویز پائے۔ وہ خود مصنف تھے، فنِ طب، انشا اور مذہبیات میں استعداد رکھتے تھے، اُن کے جاری کردہ سکوں کی دھوم آج سارے عالم میں ہے۔ ان کا سوچا ہوا عدالت عالیہ نئے طرز کا شاہکار تھا۔ ہر مجرم کو اس کے جرم کی یہ سزا تھی کہ ایک پودا لگا کر اُس کو اُگائے۔ معمولی جرم کے لیے جلد اُگنے والا درخت تجویز پاتا اور سنگین جرم کے لیے دیر پا درخت جیسے ناریل یا آم وغیرہ۔ تجارت کو فروغ دینے کے لیے ایک ایسا ادارہ قایم کیا جس میں کم سرمایہ والوں کو زیادہ منافع ملنے کا امکان تھا۔ شراب حرام کر دی گئی، عصمت فروشی کو جرم قرار دیا گیا، غلامی کا انسداد کیا گیا، ستر پوشی لازمی قرار

دی گئی، بے جا رسومات و خرافات و اسرافات کا قلعہ قمع کیا گیا۔ غرض سلطان کی ندرت فکر وعمل یہ کہتی ہے کہ ذہنی فوقیت بشر کو فوق البشر تک لے جاتی ہے ۔اِس دنیا میں اگر عزت سے جینا ہو تو سلطان کی اولوالعزمی، ہمّت، حوصلہ، اختراع، اجتہاد اور ندرت فکر وعمل کو اپنانا ہوگا۔

چوتھا اہم سبق اُن کا فلسفۂ حیات ہے جس کو علامہ اقبالؔ سے بڑھ کر کسی نے نہیں سمجھا۔ اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ انسان کی عقل کب کافور ہوتی ہے تو جواب عرض ہے کہ جب فکر کو ترک کر دیا جائے ۔ اِسی طرح قلب کی موت ذکر کے ترک کرنے سے واقع ہوگی، فکر و ذکر نہ ہو تو ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہوگی۔ وہ زندگی ہی کیا جہاں نہ عقل کا دخل ہو اور نہ قلب میں حرکت ۔ سلطان شہید کے زمانے میں کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئی۔ بجز ذہن سلطانی کے، کہ فرنگی سیلاب کا ملک پر کیا اثر پڑے گا! اور نہ اس کا ذکر کسی کے لب پر آیا۔ بجز ذہن سلطانی ۔اسی لیے اِس دیش کو تقریباً دو صد سال تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا، اور اس کا خمیازہ ہر شخص کو بھگتنا پڑا۔ فرد ہو یا ملت یا ملک سب پر یہ ضروری

ہے کہ عقل و دل و نگاہ کو مضبوط رکھے، ورنہ انسان تن آسانیوں میں پھنس جائے گا۔ جہاں صرف تن آسانیوں ہوں، عیش و عشرت ہو اور فکرِ فلک پیمانہ ہو، شوقِ بے پروا نہ ہو، وہاں غضب الٰہی ناگزیر بن جاتا ہے۔ جس کا اشارہ علامہ اقبالؔ کی نظم غلام رہیلہ میں ہمیں ملتی ہے۔ اُس ظالم رہیلہ نے اُن شہزادیوں کو سامان طرب بنایا جن کا حسن مہر و ماہ و اختر سے بھی نہاں تھا۔ جب اُس نے اپنی تیغ آتش فشاں کھولی، ایک طرف رکھ دی، کچھ سوچ کر لیٹ گیا، پھر اٹھا، اور کہنے لگا کہ اُس کا مسند پر سو جانا ایک بناوٹ تھی تکلف تھا، مگر مقصد یہ تھا کہ وہ غافل سمجھ کر کوئی تیمور کی بیٹی اُس کو مار ڈالے ؎

مگر یہ راز آخر کھُل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

سلطان شہید اِس حمیت کی دھار کو عقل و دل و نگاہ سے پھر تیز کرنا چاہتے تھے۔ فتح المجاہدین جو آپ نے لکھوائی تھی اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہے وہی انسانِ کامل جس میں ہو معنی کی بو
نقش دیبائی وگر نہ صورت انسان ہے

عقل وشعور و فکر و ذکر سے ہی انسان بنتا ہے، ورنہ وہ اطلس و دیبا میں ملبوس ایک چلتا پھرتا لاشہ ہے۔

پانچواں اور سب سے اہم سبق سلطان کا حُبِّ اسلام و حُبِّ رسولؐ تھا۔ وہ مردِ مومن تھے۔ عاشقِ رسولؐ تھے۔ انسانِ کامل تھے۔ اسلامی شان کے دلدادہ تھے۔ ذاتِ مطلق و دینِ برحق کے شعور سے معمور تھے، دولتِ عرفاں سے بھی مخمور تھے۔ عجز و نیاز و خدمت خلقِ خدا میں بھی مصروف تھے۔ اپنی سرکار کو مالک کی دین سمجھتے تھے اور اسی لیے اُس کا نام سلطنت خداداد رکھا گیا۔ ان کا یہ شعور سارے عالمِ اسلام کو اُن کا زاویہ نگاہ بنا رکھا تھا اور اُس کی پستی سے یہ مضطرب و بے چین تھے۔ ہر لحاظ سے وہ چاہتے تھے کہ ملت اسلامیہ کا بول بالا ہو۔ اِسی لیے کبھی دولت عثمانیہ سے رابطہ قایم کیا۔ کبھی افغانستان سے، کبھی ایران سے، کبھی مغلیہ خاندان سے اور کبھی حیدرآبادی نظام سے۔ تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ اٹھارہویں صدی میں سلطان سے بڑھ کر کوئی ذی فہم فرمانروا ملت اسلامیہ کی خدمت میں اس قدر سرگرم عمل نہ رہا۔ جب دیگر اسلامی ممالک پر اُن کے احساسات

اثر انداز نہ ہو سکے تو وہ اپنی ہی سلطنت میں صحیح اسلامی نظام
جس کا دوسرا نام انسانیت ہے، قایم کیا۔ ہر جگہ حق وانصاف،
ہمدردی ورواداری، فیاضی واصول پرستی، رعایا پروری واخلاق
کی درستگی میں لگے رہے۔ سلطان چاہتے تھے کہ دعوتِ
اسلام دوسروں کو پیش کرنے سے قبل ہم خود مکمل اسلامی فضائل
کے حامل بن جائیں، جن میں توحید کے علاوہ حیا، امانت،
صدق، اخوت، مروت، مساوات وحقیقت پسندی بھی شامل
ہیں۔ انسان کو مادی ضرورتوں سے زیادہ روحانی وانسانی ضرورتوں
کا زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔ جہاں صبر وشکر وفقر وغنا ہو۔
جہاں فکر انسانی احتسابِ کائنات میں لگی ہو، جہاں قلب
حقیقتوں کے پردے فاش کرتے میں مصروف ہو اور جہاں
ہاتھ کارسازِ حقیقی کے تخلیقی نمونوں کی اتباع کرنے میں
محو ہو، وہاں سکون واطمینان ہی نہیں بلکہ راحت و
مسرت بھی حاصل ہو گی۔ مادی اور اخلاقی اقدار کا
امتزاج جو سلطان کا مسلک تھا، سچی کامیابی کا
مژدہ تھا۔ سلطان میں محض فہم وذکا ہی نہیں بلکہ
فراست وجہاں بینی بھی موجود تھی جو اُن کے خیالات و

جذبات کو عملی جامہ پہنانے میں معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔ چنانچہ وہ جانتے تھے کہ حق ایک لازوال قوت ہے جو ابدی ترویج کا باعث بنتی ہے۔ تخلیق قانون حیات ہے۔ اور توحید کی اصل تسخیر کائنات ہے۔ سلطان میں یہ نکتہ گھر کر چکا تھا۔ اسی لیے اُن کا ذہن ہفت اقلیم کے گرد گھومتا تھا، کبھی نجف کبھی کربلا، کبھی پیرس کبھی قسطنطنیہ، کبھی مسقط کبھی جدہ، کبھی کابل کبھی طہران، سلطان حیات کی موجوں سے آگاہ تھے اور زندگی کے پُر شور سمندروں کی تہہ سے گہر آبدار کے متلاشی تھے۔ افسوس کہ گردش ایام نے ان کا ساتھ نہ دیا، لیکن ہمارے لیے اُنھوں نے یہ سبق چھوڑا ہے ؎

انگلیاں تھام کے غیروں کی چلو گے کب تک
زندگی آپ ہی بنتی ہے سہاروں سے نہیں

٭

سر مرزا محمد اسمٰعیل

بھارت میں بار بار یہ سوال اٹھتا ہے کہ مسلمانوں نے اس کو کیا دیا؟ اس کا جواب یہی ہے کہ اُنھوں نے کیا نہیں دیا؟ خلقت کی وحدانیت، اخوت و مساوات کا عظیم پیغام یہاں کہاں موجود تھا؟ جمالیات کا وہ تصوّر جو قطب مینار گول گنبد، دیوانِ عام، دیوانِ خاص۔ موتی مسجد و تاج محل کی شکل میں ظہور میں آیا کس نے پیش کیا؟ نظامِ سلطنت کے اصول جو ابوالفضل نے آئین اکبری میں تراشے اُن سے بہتر نظام کہاں دیکھا گیا ہے؟ اس ملک کی تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور زرعی طاقت کو فروغ دینے میں مسلمانوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ وہ کس کا خون تھا جس نے منگولوں کے حملوں کو روکا؟ وہ کس کی دُور اندیشی و شجاعت تھی جس نے بھارت کو عبّاسیہ خلافت کے حشر سے نجات

دی؟ وہ کون تھے جنھوں نے چنگیز و ہلاکو کے قیامت خیز دھاکوں سے ہندستان کو محفوظ رکھا؟ ملک کی آزادی کے لیے حضرت ٹیپو سلطان شہید سے بڑھ کر کس نے جد و جہد کی؟ وطن کی حرّیت کے نعرے شیخ الہند محمود الحسن، محمد علی جوہر و مولانا آزاد سے بڑھ کر کس نے بلند کیے؟ کامریڈ و الہلال و البلاغ سے زیادہ تحریک آزادی پر ولولہ خیز تحریریں کہاں اور کب چھپی ہیں؟ ایسے ہی سلیم و عظیم ہستیوں کی صف میں سرمرزا محمد اسمٰعیل کا نام نامی بھی آتا ہے۔

سرمرزا اسمٰعیل کا سب سے بڑا کارنامہ ریاستِ میسور کو ہندستان کے صنعتی، معاشی، تعلیمی، تہذیبی و انتظامی لحاظ سے مثالی ریاست بنا کر پیش کرنا تھا۔ ان کے کام کی عظمت کا اقرار اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ انتہائی ناسازگار حالات میں صرف اپنی جد و جہد و دُور اندیشی سے کامیابی حاصل کرتے رہے۔ ایک نہیں کئی رکاوٹیں سدِّ راہ تھیں۔ پہلا: غیر ملکی اقتدار یہ نہیں چاہتا تھا کہ میسور کا نظامِ حکومت، برطانوی نظامِ حکومت پر سبقت لے جائے۔ ہر دیسی ریاست کا حکمران ریزیڈنٹ کی کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ برطانوی سامراجیت اس

تملک کا خون چوس رہی تھی۔ یہاں کی دولت لوٹ رہی تھی۔ یہاں کے عوام کو غریب و کنگال بنا رہی تھی۔ ایسے وقت میں وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اور ریاست یہ کر دکھائے کہ ملک خوش حال ہو، صنعت و حرفت فروغ پر ہو، زراعت و تجارت ترقی کرے، شہر آباد ہوں اور رعایا امن و سکون سے زندگی بسر کرے۔ سر مرزا نے ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ انگریزوں کے جال سے بچتے رہے اور مسلسل پندرہ سال تک دیوان کے عہدے پر فائز رہے۔ جو انھیں کا حق تھا۔ اس کے برعکس ۳۵ رلاکھ کا وہ خراج جو ۱۷۹۹ء سے چلا آرہا تھا مرزا نے اس میں ½ ۱۰ رلاکھ کی تخفیف کی کامیابی حاصل کر لی۔ جو ریاست کی مالی حالت بہتر بنانے میں بڑی سہولت کا باعث بنی۔

سر مرزا کے لیے دوسری رکاوٹ انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے شروع ہوئی۔ کانگریس چاہتی تھی کہ حکومت و اقتدار اُس کے ہاتھ آجائے۔ راجہ صرف آئینی حکمران رہے۔ اور دیوان کے سارے اختیارات موقوف ہو جائیں۔ یہ بات نہ انگریزوں کو پسند تھی اور نہ مہاراجہ کو اور نہ دیوان

کو۔ مہاراجہ اور دیوان کا ایک ہی مقصد تھا۔ عوام کی خوش حالی وہ نہیں چاہتے تھے کہ سیاست کی باگ ڈور ریاست سے باہر چلی جائے۔ یہاں مرزا کو کافی کوفت ہوئی۔ گو کہ کانگریس کے قائد یہ جانتے تھے کہ میسور کا نظام سارے ہندستان میں بہتر ہے۔ گاندھی جی نے یہاں تک کہہ دیا کہ مرزا نے رام راجیہ کا خواب سچا کر دکھایا ہے۔ اس کے باوجود کانگریس کے کارکن کافی ہلڑ مچاتے رہے۔

سر مرزا کے راستے میں تیسری رکاوٹ فرقہ وارانہ ذہنیت تھی۔ تعصب و تنگ نظر لوگ یہ نہیں چاہتے کہ ایک مسلمان اعلا عہدہ پر برقرار رہے۔ کافی سازشیں ہوئیں، فسادات برپا کیے گئے۔ بنگلور میں گولی چلی اور دیگر مقامات پر بھی گڑبڑ ہوئی۔ لیکن مہاراجہ کرشن راج وڈیر کی یہ شرافت تھی کہ وہ ان مرحلوں میں نہ پھنسے۔ انھوں نے مرزا کی بھرپور حمایت کی۔

ان مشکلات کے باوجود مرزا کی ان تھک کوششوں کی وجہ سے ریاستِ میسور معاشی و صنعتی لحاظ سے حیرت انگیز ترقی کرتی رہی۔ صرف دس سال کی قلیل مدت میں مرزا

نے کئی کارخانے قایم کیے۔ صابن کا کارخانہ، شکر کا کارخانہ، سیمنٹ کا کارخانہ، کاغذ کا کارخانہ، بجلی کے لیمپ بنانے کا کارخانہ، دیا سلائی بنانے کا کارخانہ، ریشم کا کارخانہ، چینی کے برتن بنانے کا کارخانہ، صندل کی لکڑی سے تیل نکالنے کا کارخانہ، کیمیائی کھاد کا کارخانہ، چرم سے متعلق کارخانہ، غرض کئی ایک دیگر کارخانے ان کی کوششوں سے ظہور میں آئے۔ ۱۹۱۸ء میں اُنھوں نے جو ریڈیو پر تقریر کی، اس سے اندازہ ہوگا کہ میسور اُن کے دَور میں اس قدر ترقی کرچکا تھا۔ مرزا نے کہا :-

"ہر میسوری کو فخر و ناز سے یہ کرنا ہوگا کہ
وہ صرف میسور کے صابن سے نہائے۔
صرف میسور کے تولیہ سے اپنا جسم خشک
کرے، میسور کے غلّے سے اپنا پیٹ بھرے،
میسور کی ترقی میں ہاتھ بٹائے۔ میسور کے گھوڑے
پر سواری کرے، میسور کے ریشم سے اپنے
کو ملبوس کرے۔ میسور کی لکڑی، میسور کی
سیمنٹ اور میسور کے لوہے و فولاد سے

اپنے مکان تعمیر کرے، میسور کے فرنیچر سے
اپنا گھر سنوارے، میسور کے لیمپ سے اپنا
گھر روشن کرے اور میسور کے کاغذ پر اپنے
خطوط لکھے۔"

سر مرزا اسمٰعیل کی خواہش تھی کہ بنگلور میں بمبئی کے مشہور سرمایہ دار ہیرا چند والچند سے مل کر امریکی جنرل موٹرز کی تکنیکی مدد لے کر موٹر کار کا ایک عظیم کارخانہ قایم کیا جائے۔ اس تجویز کی کامیابی کے لیے اُنھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، لیکن بدقسمتی سے یہ ہونے نہ پایا۔ انگریزوں کے کان کھڑے ہو گئے کہ اس سے اُن کے مفاد کو دھکّہ لگے گا۔ کرشن وڈیر کی جگہ جے چام راج وڈیر جو نئے تخت نشین ہوئے تھے، انگریزوں کی چال سے بچ نہ سکے۔ مرزا کو برطرف کر دیا گیا۔ یہ مئی ۱۹۴۱ء میں ہوا۔

سر مرزا کے اتنے ہی کارنامے نہیں، بلکہ سماجی، تعلیمی، انتظامی، زراعتی، تجارتی شعبوں میں بھی اُنھوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ زمانہ دراز سے انتظامیہ میں صرف اعلا ذات یعنی برہمنوں کی ہی اجارہ داری تھی۔ گو کہ وہ

آبادی کے لحاظ سے پانچ سات فی صد سے زیادہ نہ تھے۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کا حصّہ نوے فی صد کے لگ بھگ تھا۔ سرمرزا نے اس ناانصافی کو ترک کرکے دوسری ذاتوں کو بھی برابر کا حصّہ دیا۔ اُنھیں کے زمانے میں آب پاشی کی نہریں مکمل ہوئیں، کرشنا راج ساگر پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ وہاں کا فردوس بریں باغ انھیں کے جمالیاتی ذوق کا طفیل ہے۔ ریاست میں کوآپریٹیو تحریک خوب اُبھری ۱۹۳۳ء اُن کی تعداد ۲۰۸۸ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۰۵ء میں ان کا سرمایہ صرف چودہ ہزار دو سو تیس روپے تھا۔ ۱۹۳۴ء میں وہ دو کروڑ اٹھارہ لاکھ تک پہنچ گیا۔ ہر شہر اور ہر دیہات میں بجلی کی روشنی کا انتظام کیا گیا۔ ہر جگہ چھوٹے دستکاریوں کا بندوبست کیا گیا۔ تاکہ عوام کی معاشی حالت بہتر ہو۔ بے روزگاری دُور ہو اور صنعت و حرفت فروغ پائے۔ پاکی صفائی کا یہ عالم کہ کیا مجال کہیں گندگی ہو۔ چمن بندی کا ایسا شوق کہ ہر شہر گل و گلزار کا نمونہ۔ تعمیرات کا وہ ڈھنگ کہ ہر عمارت خوب صورتی کا ایک مجسمہ۔ سڑکیں ایسی صاف ستھری کہ ابھی دُھلی ہیں۔ شہروں کی زینت اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ دیہاتوں کو بھی وہ نہیں بھولے۔

وہاں بھی پارک، وہاں بھی سلیقہ، طریقہ، نفاست، پاکی، ہسپتال، مدرسے، پس ماندہ بچّوں کے لیے صرف وظیفہ ہی نہیں، بلکہ رہائش گاہ کا انتظام، ہوسٹل، کتابیں، سلیٹ اور کپڑے، عورتوں کی تعلیم، بالغوں کی تعلیم، صنعتی و فنّی تعلیم پر خاص توجہ کی بغرض پندرہ سال کی قلیل مدّت میں مرزا نے ؎

بھر گئی آنکھ میں فردوس بریں

کا نقشہ میسور کو بخشا اور جو خواب حضرت ٹیپو سلطان شہید نے دیکھا تھا اُس کو سچّا کر دکھایا۔

آخر میں سوال یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ مرزا کی زندگی سے ہم کیا سبق سیکھ سکتے ہیں، یہی کہ زندگی کے سفر میں کہیں امن و امان نہیں صرف تیز اور موقع پرستی کی ایک جھلک ملتی ہے۔ اس جھلک میں کسی نے اگر کچھ پا لیا تو وہ کامیاب رہا۔ سر مرزا نے زندگی کے ہر نکڑ پر موقع سے فائدہ اُٹھا کر کامیابی وجمالیات کے پھول چن لیے۔ اپنا فرض حُسن وخوبی سے ادا کیا۔ اپنی ساری صلاحیتوں وقابلیتوں کو کام میں لا کر صالح زندگی کے اصول بنائے اور کر دکھائے۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے خیالات

کو تمناؤں کا تازیانہ چاہیئے اور ہمارے تمناؤں کو خیالات کی تجلّی چاہیئے ۔ یعنی جب تک ہم میں کام کا ولولہ و جوش و خروش نہ ہو، ہمارے بلند سے بلند خیالات بھی برف کی طرح منجمد رہ جائیں گے اور جب تک اس ولولہ و جوش میں ہوش کی روشنی نہ ہو ہم بھٹکتے ہی رہیں گے ۔ سرمرزا میں جوش و ہوش دونوں موجود تھے ۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ زندگی کا اہم مقصد یہ ہے کہ انسان کو سطحی لوازم سے اُبھر کر اس مقام پر آنا ہے ۔ جہاں ذہنِ انسانی آئینِ فطرت سے مطابقت رکھتا ہو۔ یعنی یہ احساس ہو کہ دُنیا کی ہر شئے کسی اور شئے کے لیے ہے، خود کے لیے نہیں۔ اس کرۂ ارض کی عظیم ہستیاں اِس لیے زندہ جاوید ہیں کہ وہ خود کے لیے نہیں کسی اور کے لیے زندہ تھے ۔ ان کی ذات سے دوسروں کو فیض پہنچتا تھا۔ خدمتِ خلق کو انھوں نے آخرت کا توشہ سمجھا۔ زندگی کو قدرت کی امانت سمجھ کر دوسروں کے لیے وقف کر دیا۔ سرمرزا بھی انھیں لوگوں میں سے تھے ۔

ایک اور بات کہنی لازمی ہوگی ۔ سرمرزا نے اپنی ساری زندگی میسور کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دی تھی۔ شاید انھوں نے خالق کی بھی اتنی عبادت نہ کی ہوگی جتنی کہ اس

اس ریاست کی بندگی کی ہے ۔ لیکن آج انھیں کوئی نہیں جانتا ۔ ان کی یاد ہمارے ذہنوں سے مٹتی جارہی ہے ۔کیونکہ اس ریاست کے محسن کے شخصیت کے کارناموں کو سامنے لانے کی کوشش کسی سطح پر نہیں ہورہی ہے ۔ہاں یہ اچھی بات ہے کہ ان کے ہم عصروں کے کاموں اور کارناموں کو اجاگر کیا جارہا ہے ۔ ان کے نام سے ادارے قایم ہورہے ہیں اسی طرح سر مرزا محمد اسمٰعیل کے ان گنت کارہائے نمایاں جن سے آج بھی میسور اسٹیٹ برابر مالی ،صنعتی ، معاشرتی فائدہ حاصل کررہی ہے ۔ ان کے لگائے ہوئے پودے ثمردار شاخوں سے لد گئے ہیں ۔ ان کو خراج عقیدت پیش نہ کرنا احسان فراموشی ہے ، ریاست کرناٹک کا یہ فرض ہے کہ ان کے کاموں کی تفصیل عوام کے سامنے پیش کرنے کے منصوبے بنائے اور ریاست کے اس محسن کا شایانِ شان یادگار قایم کرے تاکہ ریاست کی قومی یک جہتی کو یہاں سے ٹھنڈی ہوا کے معطر جھونکے خوشگوار فضا فراہم کریں ۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

سر سید کے چمن کا ایک مہکتا گلاب اُردو ادب کا ایک گنجہائے گرانمایہ، لطیف مزاح سے دلوں کو گدگدانے والا ایک ساحر، اور شرافت نفس کی ایک بے نظیر مثال، پروفیسر رشید احمد صدیقی فیضان سماوی کی طرف سے ہر اردو داں کے لیے ایک نعمتِ عظمٰی تھے۔ یہ وہ ہستی تھی جس کے بول سے ہر مایوس دل مسرت سے اچھل پڑتا تھا اور وہ ادیب تھے جس کے قلم سے ظرافت کے چشمے ابلتے تھے، سلاست وشیرینی کے دریا بہتے تھے۔ اور طنز و مزاح کا ایک طوفان اُٹھتا تھا۔ وہ بذاتہٖ ایک انجمن تھے جس نے ایک طویل مدت تک صرف علی گڑھ کی علمی وادبی فضا کو ہی معطر نہ کیا تھا، بلکہ سارے برصغیر کی فضا کو مہکایا تھا۔ اُن کی سوچ میں دل کی کلی کھلانے والی ایسی زبردست قوت

موجود تھی کہ سخت سے سخت مزاج کی چٹان بھی چور چور ہو جاتی۔
اُن کا اندازِ بیان ایسا دلکش اور دلفریب ہوتا کہ پڑھنے والا باغِ جناں کی سیر میں مست رہتا۔ زندگی کے سنگین مسائل اُن کا موضوع نہ ہوتے بلکہ عوام الناس کی وہ معمولی حرکتیں، روزمرہ کے وہ چھوٹے موٹے واقعات، طبع انسانی کی وہ بلندیاں یا پستیاں، احساسات و تجربات و فطرت بشری کے وہ نفیس و نازک پہلو جن کو ہم نظر انداز کر جاتے ہیں، ان کا موضوع بنتے اور اُن کے شعور میں ڈھل کر ایسی نادر صورت اختیار کر لیتے جن کا مجموعہ ادب کا بہترین سرمایہ بن گیا ہے۔ ادب کا تعلق اُن تخلیقات سے ہے جو زندگی کے ہر پہلو کو ایسے نرالے انداز سے پیش کرے جس میں حقیقت کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ اس عمل میں جمالیات کا بڑا دخل ہو۔ جہاں ادب آرٹ بن جاتا ہے اور نطق و بیان کی جادوگری سے دلوں کو مسحور کر لیتا ہے۔
رشید صاحب کو اِس کمال میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔
علی گڑھ کی عزّ و شان رشید صاحب جیسی عظیم ہستیوں سے رہی ہے۔ وہ اِس دانش گاہ کی روحِ رواں تھے۔ اُن کا مقام اس لیے بلند ہے کہ اُ کی سوچ میں دو باتیں بدرجہ اتم

پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جو بھی کہتے تھے تعجب خیز بات ہوتی تھی، اصلیت وحقیقت میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھی، اُن کے ذہن کی رسائی کا مظہر ہوتی تھی اور پڑھنے والے کو متحیر کر دیتی تھی۔ دوسری بات یہ کہ وہ مزاح کا نادر نمونہ ہوتی اور اس قدر لطیف ہوتی کہ دل چٹکیاں لیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کسی بات کو حقیقت کے قریب تر لانا کچھ آسان کام نہیں۔ اس کے لیے علم و حکمت چاہیئے، نفسیاتی تجزیہ کی صلاحیت چاہیئے۔ مشاہدات و تجربات کا انبار چاہیئے۔ ہمارے ادبی، تہذیبی وتمدنی روایات سے بھرپور واقفیت چاہیئے۔ ہمارے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات سے گہری آگہی چاہیئے۔ ان سب کو گھول کر، اُن کو تپا کر، اُن کا جوہر اخذ کرنے کی قابلیت چاہیئے۔ ایسے آپریشن کے رشید صاحب ماہر تھے۔

طرزِ تحریر بھی ایسا جو دلوں کو مسخر کرے، آسان کام نہیں۔ یہ انفرادی چیز ہے، خداداد قابلیت ہے، ہر ادیب کا ایک خاص ڈھنگ ہے جو ادب کے میدان میں ادیب کا مقام معین کرتا ہے۔ رشید صاحب اپنے اندازِ بیان کی وجہ سے مقبولیت کی چوٹی پر پہنچ چکے تھے۔ ظرافت کے میدان کے

غازی تھے، لیکن ایسی شستہ ظرافت کہ جس سے لطف اندوز ہونے کے لیے بھی اونچا تعلیمی معیار چاہیئے۔ اُن کے بیان میں ایسی نکتہ رس باتیں ہوتیں کہ وہ صاحبِ شعور کو تڑپا دیتیں اوروں کو تو وہ بات معمولی نظر آتی۔ لیکن صاحب نظر کے لیے اُس میں ایک دریا موجزن ہوتا۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ جب کہ جامعہ ملیہ ابھی نیا نیا بن رہا تھا، رشید صاحب کا ذاکر صاحب سے یہ مکالمہ رہا:۔

"جامعہ کو دیکھنے کے لیے بڑے سے بڑے ماہرین تعلیم اور مبصّرین فن وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک اُس کے بارے میں اچھّے سے اچھے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ایک دن میں نے ذاکر صاحب سے پوچھا۔" کیوں مرشد! یہ جتنے عزیب جامعہ کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں ان کو ساری چیزیں دکھاتا بتاتا کون ہے"؟ فرمایا:" بالعموم میں ہی ہوتا ہوں" میں چپ ہوگیا۔ ذاکر صاحب چونکے اور پوچھنے لگے،

"اس سوال کا مقصد کیا ہے؟" میں نے
کہا۔ "کوئی مقصد نہیں، بقول آپ کے
میں نے یہ بات محض معلومات میں اضافہ
کرنے کے لیے پوچھ لی" ذاکر صاحب نہ مانے
اور بولے۔"یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے ذہن
میں حسب معمول کوئی فتنہ بیدار ہوا ہے،
آپ کو بتانا پڑے گا" میں نے کہا۔
مرشدا بات کوئی نہیں ہے۔ آپ سے
صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کبھی بہرائچ
گئے ہیں؟" بولے نہیں" میں نے کہا
"خیر آپ نے غازی میاں کا میلہ تو دیکھا
ہوگا" بولے۔"جی میں نے دیکھا ہو یا
نہیں آپ اپنا مطلب سنائیے۔ میں
نے کہا"

ارے وہی جہاں ڈفالی لہک لہک کر گاتے پکارتے ہیں:
اندھے پائیں گے چسم (چشم)؛ کوڑھی پائیں گے سریر (جسم)
میاں سے مرادی مانگ لے

ذاکر صاحب فرطِ انبساط سے اچھل پڑے اور بولے
"کیا غزل سنائی ہے جھک ماریں تمام دنیا کے شاعر مصلح اور لیڈر اُس کے آگے" تھوڑی دیر تک اس پر گفتگو رہی، اس کے بعد بولے، "لیکن اِس مبتدا کی خبر تو سنائیے"۔

میں نے کہا:—

"مرشد! میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر آپ کے ساتھ غازی میاں کے میلے میں دنیا کا بڑے سے بڑا مفکر ہو اور آپ ذرا جی لگا کر اُسے یہ بتا دیں کہ یہ میلہ نہیں ہے بلکہ اقوامِ عالم کی پارلیمنٹ ہے جہاں مفکرین و مصلحین اعظم متفق و متحد پا کر انسانیت کو اوجِ سعادت و کامرانی پر فائز کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں تو وہ بے چون و چرا تسلیم کرے گا اور تمام عمر اپنی قسمت پر ناز کرے گا کہ آپ کے توسّل سے وہ دنیا کے سب سے نئے اور سب سے بڑے اور سب سے مبارک تجربہ سے آشنا ہوا"۔ مرشد نے اِس کے بعد کیا کہا اور مجھے کیا سننا پڑا، کاش ہم میں سے ہر ایک سنتا۔ لیکن وہ باتیں ایسی نہیں ہیں جو ہر کس و ناکس کو

بتائی سنائی جائیں البتہ میں بہت خوش ہوا کہ میرا مقصد
پورا ہوا۔ یعنی مرشد پر جلال طاری ہوتا ہے تو کیا
ہوتا ہے " (ہمارے ذاکر صاحب ص۴۸ تا ۴۹)۔

اس مکالمے میں کیا طنز ہے، کیا مزاح ہے، کسی کو اکسانے کا کیا رنگ ہے، معلومات کے موتی پانے کا کیا ڈھنگ ہے اور آخری جملوں میں ضمیر پاک کی کیا نورانی شکل ہے اس کی داد ہر کس و ناکس نہیں دے پائیں گے۔ ظرافت اس لیے مقبول ہے کہ عوام الناس اپنے غم روزگار سے تنگ ہیں۔ زندگی کا بوجھ ہی کیا کم ہے کہ مزید تلخیوں سے بھرا، لیکن حقائق سے لبریز لٹریچر کا بوجھ بھی سر پر اٹھائیں؟ اس لیے ہر شخص کا دل چاہتا ہے کہ کم از کم کسی کے دو اچھے بولوں سے جی ہلکا کرلے۔ ایک دو باتیں ہنسی مذاق کی بھی ہو جائیں۔ وحشت و دہشت، غم و غصّہ، ظلم و تشدد، بیدردی و بے رحمی، خود غرضی و خود پسندی، نفرت و نخوت کے اس بازار میں اگر مسرت کے دو پھول کہیں بکتے ہوں، تو دل چاہتا ہے کہ ضرور خرید لیں۔ اسی لیے لوگ رشید صاحب کی دُکان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہاں کا ماحول ہی دیگر ہے۔ یہاں اخلاقیات کا سبق فلسفہ کے ذریعہ نہیں دیا جاتا بلکہ ایسی

مثالوں سے کہ تو د اپنا ضمیر کہہ اٹھے کہ کونسی بات ٹھیک ہے اور کونسی نہیں۔ سامنے آئینہ رکھ دیا جاتا ہے کہ ہو سکے تو ہم اپنے چہرے کے سیاہ داغ بھی دیکھ لیں اور دھولیں اور یہ آئینہ اِس خوش اسلوبی سے ہمارے ہاتھ تھمایا جاتا ہے کہ ہنستے ہنستے یہ پتہ نہیں چلے گا کہ ہماری ہی کہانی کسی اور کے زبانی سنائی جارہی ہے۔

اسی طرح اخلاقیات ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر موڑ سے وابستہ واقعات کا ذکر رشید صاحب کے ہاں ملتا ہے۔ اِن کو انھوں نے اپنی بصیرت کی آنکھ سے دیکھا ہے، فلسفی کے ذہن سے جانچا ہے، نفسیاتی ماہر کے انداز میں پرکھا ہے، ادبی کمال کے ڈھانچے میں ڈھالا ہے اور ظرافت کے زیور سے آراستہ کیا ہے۔ یہاں ہمیں علم و ادب کی باتیں بھی ملتی ہیں، اخلاق و عادات کی بھی، رسم و رواج کی بھی، رہن سہن کی بھی، تعلیم و تربیت کی بھی، یہاں اچھے اور بُرے کی تمیز کا پتہ بھی چلتا ہے، نیک و بد کے کردار کا بھی، خود بینی و جہاں بینی کا بھی، عالم جاہل کی تفریق بھی، امیر فقیر کے رجحانات بھی، محبت والفت کے اثرات بھی، رحم و کرم اور سخاوت و جودت کی فتوحات بھی، نفرت و نخوت اور فرعونیت کے انجامات بھی، غرض رشید

صاحب کی دُکان انسانی حرکات، سکنات، جذبات، احساسات و خواہشات سے بھری پڑی ہے اور ہر شئے نفیس طریقہ سے مزاح کے ڈبّے میں پیک ہوئی ہے۔

آخر میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ہم رشید صاحب سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟ اولاً یہ کہ ادیب وہ حکیم ہے جو انسانیت کی نبض پرکھتا ہو، وہ معلم ہے جو خود شناس، خدا شناس اور جہاں شناس ہو اور وہ معمار ہے جو سماج کی بہبودی کا مینار بلند کرتا ہو۔ رشید صاحب میں یہ تینوں باتیں موجود تھیں۔ دوم یہ کہ ادب زندگی کا آئینہ ہی نہیں بلکہ رہبر بھی ہے۔ جو پیش آنے والے نشیب و فراز اور خطرناک وادیوں کے بارے میں پیشگی خبردار کرتا ہے۔ اصلاح اس کا مقصد ہے، اطلاع اس کا منشا ہے تغیر و تبدیلی اس کا پیغام ہے، تجسس و تفکر اس کا دھندہ ہے، ذہنی رفعت اس کا مدعا ہے اور صالح نظام حیات اس کا نصب العین ہے۔ رشید صاحب اس قسم کے مشغلہ میں تا عمر مشغول رہے۔ سوم یہ کہ اِس سرائے فانی میں عظمت اُس ہستی کی ہے جو شریف النفس ہو، جو سلیم الطبع ہو، جو حلیم المزاج ہو، جس میں ذوق لطیف ہو، جس میں بلند خیالی ہو، جس کا ضمیر پاک ہو، جس کا دل صاف ہو،

جس کا عمل نیک ہو اور جس کی ذات سے سب کو فیض ہو ، یہ سب باتیں رشید صاحب میں موجود تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ یہ دوسروں میں بھی ہوں۔ چہارم یہ کہ اُردو ادب میں ظرافت کا بھی بڑا مقام ہے۔ یہ بہت ہی مشکل آرٹ ہے۔ زندہ دلی آسان نہیں ، ہمہ شما اس کا حقدار نہیں۔ یہ لوہار کا کام نہیں، سُنار کا کام ہے۔ بات میں بات پیدا کر کے لطافت کا لبادہ اُڑھانا کھیل نہیں۔ ظرافت کوئی امتحان نہیں کہ کوشش کر کے پاس کر لیا جائے۔ یہ ذہنی و قلبی صلاحیت ہے جو خود بخود چشمے کی طرح ابلتی ہے۔ رشید صاحب کا یہ چشمہ لازوال تھا۔ پنجم یہ کہ اُردو ادب کا خزانہ انمول موتیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان موتیوں کی قدردانی ہمارا کام ہے ، اِس میں اضافہ ہمارا فرض ہے۔ اُس کی تشہیر ہم پر لازم ہے اور اس کی توقیر و حفاظت ہم پر واجب ہے۔ ششم و آخری یہ کہ رشید صاحب کا اُردو سے رشتہ ، جسم و جان کا رشتہ تھا۔ اُردو سے اُنھیں عشق تھا۔ اُن کی ذات سے ہزاروں طالبانِ اُردو پروان چڑھے اُن کے قلم سے کئی جواہر پارے وجود میں آئے۔ اُن کے دم سے " اردوئے معلیٰ " شباب پر تھا۔ اُن کی ہستی اُردو کے

حق میں فیض عام و فوزِ عظیم تھی۔ حضورِ حق دعا ہے کہ مالک اُن کی قبر کو نور سے بھر دے، آمین، ؎

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حُنَین بھی ہے عشق

حضرت نفیس بنگلوری

شاعری ہمارے ادب کی روح ہے، ہماری تہذیب کی آبرو ہے۔ شاعر عاشق کا مزاج اور فلسفی کا دماغ رکھتا ہے۔ اس کی آنکھ میں تماشائے حیات سما جاتا ہے، اس کا تخیل ہفت اقلیم کی سیر کرتا ہے۔ اُس کا دل لطیف احساسات کا ایک سمندر ہے، اس کی نظر حقائق زندگی میں گڑی ہوتی ہے۔ اُس کی خمیر میں بجلی کی چمک، پھولوں کی مہک، مچھلی کی تڑپ اور پروانے کا سوز ہوتا ہے۔ اُس کے کلام میں خالق کی قدرت کی ترجمانی بھی ہوتی ہے اور فطرت انسانی کی عکاسی بھی۔ اُس میں اعلا افکار واقدار کا تذکرہ بھی ہوتا ہے اور بشری لغزشوں کا بھی۔ بلندیوں کا بھی، پستیوں کا بھی، شاعری اُس فن کا نام ہے جہاں احساسات، جذبات، تجربات، خیالات اور خواہشات کو یوں چست

مصرعوں میں قلمبند کیا جاتا ہے کہ گویا ایک سمندر ہے جو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ غرض شاعر تخلیق کا وہ سفیر ہے جو قدرت کا راز فاش کرتا ہے، خیالات کے موتیوں کو الفاظ کی مالا میں پروتا ہے اور اِن موتیوں کی آب و تاب کو تشبیہ و استعارہ، طنز و کنایہ سے چمکاتا ہے۔

حضرت نفیس بنگوری اِن تمام خوبیوں کے حامل تھے۔ مگر سب سے بڑھ کر وہ علامہ اقبالؔ کے اِس شعر کے مصداق تھے "عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولین ہے :. عشق نہ ہو تو شرع و دین، بتکدۂ تصورات" قدیم دور کی شاعری عشق کے گرد گھومتی ہے اور وہ ایسی ہی شاعری کے شائق تھے۔ اُن کے ہاں گل و بلبل اور ہجر و وصل کے تذکرے ہیں۔ اِس میں فرہاد و قیس کا شور و ولولہ ہے۔ ناصح پر پھبتیاں اور صلواتیں ہیں۔ جمالیات و جذبات کا ایک دریا ہے، جن کا ایک بازار ہے۔ ناز و ادا، عشوہ و شوخی، بادہ و ساغر، لطفِ بہار، چاک گریباں اور دشت جنون کی ایک داستان ہے۔ نفیس اس میدان کے شہسوار ہیں" جاؤں کیوں طور پہ، گھر بیٹھے کسی کا جلوہ :. مجھے ہر دم، مجھے ہر بار نظر آتا ہے" رومانی شاعری کے وہ شہنشاہ ہیں۔

عشق و عاشقی سے ہٹ کر، اُن کی عظمت کی مینار کسی اور قصر کی تعمیر کی وجہ نمایاں ہیں، جو اُن کی ندرت وجدت کا پتہ دیتی ہیں، جو اُن کی تحقیق و تفتیش کا پھل ہیں اور اُن کی کاوش و عرق ریزی کا ثمرہ ہیں۔ اُن کے کلام کا مجموعہ "متاعِ ہنر" انھیں حیات جاودانی نہیں بخشتا، لیکن "اصطلاحات اُردو"، "استفساراتِ نفیس" اور افاداتِ نفیس "اُردو ادب کے خزانے میں ایسے گوہر نایاب ہیں جو نفیس کو زبان اُردو کا ایک محسن اعظم کا درجہ بخشتے ہیں۔ تعجب اس بات کا کہ دہلی و لکھنؤ سے دور، بنگلور جیسے شہر میں، اُردو کے اسلوب بیان، محاورہ، روزمرہ، ردیف قافیہ، قواعد و عروض اور وزن پر ایسا ماہر بوٹا اُبھرا جس کا ثانی بمشکل نظر آتا ہے۔ کسی سرکار دربار کی حمایت افزائی سے نہیں، کسی کالج، یونیورسٹی یا ادارے کے دباؤ سے نہیں، بلکہ صرف اپنے تجسس و تفکر کے زیر اثر، تحقیق و تفتیش کے شوق میں، شاعری کی شان بڑھانے کی غرض سے اور اپنے علم و تبحر کی بھوک پیاس بجھانے کی خاطر، انھوں نے اپنے معرکتہ الآرا تصانیف کا آغاز کیا اور انجام کو پہنچایا۔ زبانِ اُردو کو ناز ہے کہ اس کے عاشقوں میں ہمیں ایک ایسا فرہاد اور قیس بھی نظر آتا ہے جس نے خود کو مٹا کر اُردو کے دامن کو پھولوں

سے بھر دیا۔

میری نظر میں "اصطلاحات اُردو" اُردو زبان کے لیے اِتنی ہی اہم ہے جتنی ڈاکٹر جانسن کی ڈکشنری انگریزی زبان کے لیے۔ ممکن ہے وہ شعلہ ہو، یہ شرر ہے، لیکن اصلیت میں دونوں ایک ہی ہیں۔ ہر زبان کی وسعت، رفعت، گہرائی اور لچک اُس کے لغت سے پہچانی جاتی ہے۔ جہاں اُس لغت کے اغراض و مقاصد عام سطح سے ہٹ کر زبان کے رکیک سے رکیک نکات کو عیاں کرے اور اس کی تشریح و تصدیق میں شعرا کا کلام پیش کرے، وہاں وہ کام ضرور قابلِ صد ہزار تحسین ہوگا۔ یہ کام نفیس نے کیا ہے۔ جہاں لغت صرف معنیٰ ہی نہیں پیش کرتا بلکہ تصدیق میں شعر بھی پیش کرتا ہے وہاں اس کی افادیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ قادر الکلام شعرا کے فن و کمال سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے، زبان کی بھی خدمت ہوتی ہے، ادب کی بھی ترویج ہوتی ہے، شعر کے معنیٰ و مطلب سے بھی لُطف اندوزی حاصل ہوتی ہے۔ گویا لغت حیلہ ہے اس چمنستان کی سیر کرنے کا جہاں کئی گلہائے رنگ و بو اپنے بہار پر ہوں۔ گویا یہ اُڑان ہے اُس فضا میں جہاں منزلِ مقصود کی مسافت

طے کرتے کرتے پرشکوہ وادیوں کے منظر سے بھی ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔ گویا حضرت نفیس نے "اصطلاحات اُردو" کی شکل میں ہمیں ایک ایسا طیارہ بخشا ہے جس میں ہم بیٹھ کر اُردو ادب و شاعری کے افلاک کی سیر کر رہے ہوں۔

"استفسارات نفیس" کو لیجئے۔ یہ بھی اُردو ادب کی ترویج میں ایک سنگ میل ہے۔ اِس کا طرز نرالا ہے۔ اُردو کی خدمت صرف شعر و شاعری، افسانہ نویسی، قصّہ گوئی، تنقید و توضیح سے ہی نہیں ہوگی بلکہ ایسے نت نئے اسلوب سے ہوگی۔ جہاں الفاظ کی تراش خراش کا بھی ہمیں علم ہو، جہاں زبان کی فصاحت و بلاغت کے اصول سے بھی واقفیت ہو، جہاں قواعد و عروض پر بھی نظر ہو اور جہاں محاورہ و روز مرہ کے صحیح استعمال کا اندازہ بھی ہو۔ نفیس نے الفاظ کے ترک و قبول، مختلف نکات سخن، مسائل زبان، قافیہ کا استعمال، تذکیر و تانیث، واحد جمع، تلفظ، املا، وغیرہ وغیرہ پر صحیح روشنی ڈالنے کی غرض سے اپنے ہم عصر شعرا سے خط و کتابت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ بڑے بڑے قادر الکلام شعرا سے رابطہ قایم کیا، سوالات کی بوچھار کا آغاز کیا۔ اس کے

ہم عصر بھی قابلِ داد ہیں جنھوں نے سیر حاصل و تشفی بخش جوابات دیے۔ نفیس نے ان کو تبرک سمجھا اور حفاظت سے محفوظ رکھا۔ اِس سے نفیس کا "سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو" کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے "گل گشت سرسری نہیں ہے۔ اس گلستان کا" سبق ملتا ہے۔ اس سے شاعری کے میدان میں نفیس کے تبحر و تفکر، ندرت و جدت کا اندازہ عیاں ہے۔ استفسارِ نفیس کیا ہے؟ ایک شاعر کی تشنگی ہے جس کو سارے برصغیر کے ساقیِ سخن آبِ کوثر سے بجھا رہے ہیں۔ ساری کتاب عروسِ سخن کی زینت کا سامان ہے۔ یہ وہ مخزن ہے جس کا ریزہ ریزہ سخن کی اصلاح کے لیے نسخۂ کیمیا ہے، اور یہ وہ موسلا دھار بارش ہے جو گلشنِ سخن کو خس و خاشاک سے پاک رکھ کر گل گلزار بنانے کا کام انجام دے سکتی ہے۔

"افاداتِ نفیس" کو لیجیے۔ یہ مشاہیرِ سخن کے مکاتیب ہیں، ایک دو نہیں چھبیس[۲۶] مشاہیر کے۔ یہ وہ ادبی خطوط ہیں جن سے نفیس کا علمی ذوق، تحقیق و تفتیش کا شوق، سخن سے والہانہ عشق، جد و جہد و کوشش اور صبر و استقلال کا پتہ چلتا ہے۔ اِن سے نفیس کے رفقائے کار، اُن کی علمی سرگرمیاں، ذاتی تجربات،

سوچنے سمجھنے کا انداز، اصلاح کا جذبہ، نفاست وسلاست وبلاغت کا خیال، اہم نکات پر سیر حاصل توضیح، اس دور کے فنی کمالات وغیرہ وغیرہ پر ایسے دلچسپ بیان ہمارے سامنے آتے ہیں جو کسی بھی ادب کا مایہ ناز سرمایہ بن سکتے ہیں۔ اِن سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ نفیس کا دائرہ عمل کس قدر وسیع تھا مشاہیر ہند نفیس کو کس عزت واحترام سے دیکھتے تھے۔ نفیس کیسے بار بار مشاہیر کے ذہنوں کو جھنجوڑتا تھا۔ کون ہے آج جو اِس انہماک و جذب مستی سے عروس اُردو کا سنگھار کرے ؟

"افاداتِ نفیس" کیا ہے ؟ اُردو کے خزانے میں آبدار موتیوں کی ایک مالا ہے، یہ وہ آئینہ ہے جس میں عاشقانِ سخن کی روح جھلکتی ہے۔

آخر میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ نفیس کا کیا مقام ہے اور اس سے کیا ہم سیکھ سکتے ہیں؟ اول یہ کہ اس کا مقام بہت بلند ہے۔ کسی ہستی کی عظمت اس کی ظاہری کامیابی سے جانچی نہیں جاتی۔ زمانہ عظمت کا تاج ان کے سر پر بھی رکھتا ہے جو تقلید کی بجائے اپنے تجرباتی ادراک وعمل سے ادب کے دامن کو صدہا گلہائے رنگ و بو سے نوازتے ہیں۔

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے ؏ زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا" دوم یہ کہ عظمت کے لیے ذہانت وفراست وریاضت چاہیئے۔ صبر واستقلال وعزم وخلوص چاہیئے، ہمت وحوصلہ وتپش وتڑپ چاہیئے۔ نفیس میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ سخت کوشی کے وہ عادی تھے، عزم راسخ کے وہ حامل تھے۔ "فرہاد کی مرقد سے یہ آتی ہیں صدائیں ـ برباد کسی شخص کی محنت نہیں جاتی"۔ سوم یہ کہ انسان جب زمانہ کی زنجیر ایام توڑ جاتا ہے تو پیچھے کیا چھوڑ جاتا ہے؟ تین باتیں، اوصاف حمیدہ، نیکی کے نقوش اور صالح اولاد۔ نفیس اِن باتوں میں خوش نصیب رہا۔ وہ کئی خوبیوں کا حامل تھا جو احسن الخالقین میں ہونی چاہیئے۔ بے لوث محبت، بے باک صداقت، بے انتہا مروت، بے مثال شرافت، اُس کا شعار تھا۔ حد درجہ غیور، حق گو، جفاکش، پاک دل وپاک باز تھا۔ اس میں بجلی کی چمک پارے کی تڑپ، شتر کا اطمینان، چیونٹی کا انہماک اور پروانے کا سوز موجود تھا۔ نیکی کے نقوش جو اس نے ورثہ میں چھوڑے وہ اس کی تصانیف ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے وہ صالح اولاد سے بھی مزین تھا۔ نہ اس کے آبدار موتی آج منظر عام

پر نہ آتے۔ وہ صالح جانشین بھی چھوڑ گیا۔ آج بھی اس کے کئی شاگرد ہیں جو اس کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔

چہارم یہ کہ اُردو کی صحیح و سچی خدمت اُن ہستیوں سے ہوئی جو خود کو مٹا کر اُردو کے لیے وقف ہو چکے تھے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُردو کی خدمت آج اُن سے کچھ کم ہی ہو رہی ہے جو اُردو کا دم بھرتے ہیں اور سر پر اُردو کا دستارِ فضیلت تھامے ہوئے ہیں۔ یونیورسٹی کی ڈگریوں سے لدے ہوئے ہیں، وہ صرف بلبل ہیں جو فقط آواز ہے۔ ہمیں بلبل نہیں، جوئے نغمہ خواں چاہیئے جو سیلِ تندرو بن کر گلشنِ ہستی کو سرسبز و شاداب کر دے۔ نفیس جوئے نغمہ خواں تھا جو اپنے قلم سے دریائے معانی بہایا۔ اسی لیے صحیفۂ پاک میں "اِقْرَا" کے فوراً بعد "اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" آیا ہے۔ جو عالم تقریر میں مست ہیں اور تحریر سے نا محروم وہ صرف بلبل ہیں، جوئے نغمہ خواں نہیں۔ نفیس کا پیغام ہے کہ خوابِ غفلت سے جاگ جا۔

پنجم اور آخری یہ کہ اگر آج اُردو کی کچھ خدمت ہو رہی ہے تو وہ فلمی دنیا سے، قوالی سے، موسیقی سے،

صحافت سے اور اُن ادیبوں اور شعرا سے جو دیش کے چپہ چپہ میں بکھرے ہوئے اپنے فطری ذوق کی وجہ علمی مشاغل میں مصروف ہیں ۔ مگر ہماری توقع ان سے بھی ہے جو اُردو کو اپنا ذریعہ معاش بنا چکے ہیں۔ ہماری مؤدبانہ اپیل صرف اُردو کے اساتذہ سے ہی نہیں بلکہ ان پروفیسروں سے بھی ہے جو دیگر شعبوں کے ماہر ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارا انگریزی داں طبقہ اردو میں تصنیف و تالیف کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ یہ ہمارا فرض اولین ہے کہ ہماری مادری شیریں زبان اُردو جو کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی ہے اس کی خدمت میں کوتاہی نہ کریں۔ نفیس کو یاد رکھیں اور دعا کریں کہ مالک اس کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین ثم آمین۔

یادِ رفتگان

زمانہ تیزی سے بدلتا ہے۔ نصف صدی قبل کی دنیا کچھ اور تھی۔ ۱۹۴۲ء کا سال ہماری تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے، جب کہ اہلِ ہند نے للکارا تھا، "انگریز، دور ہٹو، ہندستان ہمارا ہے۔" قوموں کی زندگی میں ہی نہیں بلکہ افراد کی زندگی میں بھی، کبھی کبھی کوئی سال، کوئی مہینہ، کوئی ہفتہ نہ جانے کیوں، تاریخی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ وہی سال تھا جب کہ شہر میسور کے ایک معزز خاندان کا چشم و چراغ جو مشرقی تہذیب و تمدن کا علمبردار تھا، ریاست کی مشہور یونیورسٹی میں عربی و فارسی کی تحصیل کے لیے بی۔ اے' آنرز، میں داخلہ لیتا ہے اور اسی سال دیہات کا ایک باشی اسی یونیورسٹی میں اس ہونہار کا ہم جماعت بن جاتا

ہے، اور وہ یونیورسٹی دونوں کے لیے جزو لاینفک بن جاتی ہے۔ اُن دونوں میں ایک عربی و فارسی کا دلدادہ تھا اور دوسرا علم تاریخ کا۔ ظاہراً دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ فارسی داں، تاریخ داں سے کئی قدم آگے تھا۔ اُس کی بول چال میں تمکنت، ذہانت میں تیزی، لب و لہجہ میں دلکشی اور مزاج میں خوش طبعی کے علاوہ، وضع قطع میں بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔

فارسی داں کا چہرہ ایک نورانی ریش سے مزین تھا۔ لمبا قد، بھرا جسم، ہنس مکھ چہرہ، چمکتے دانت، بڑی بڑی آنکھیں، لمبی ناک، چوڑی پیشانی، سر پر ایک مخمل کی ٹوپی، اور بدن میں ایک خوب صورت شیروانی، یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک نوشہ خراماں خراماں چلا آرہا ہے۔ ظاہر ہے کہ سارے ہم جماعت اس کے دلدادہ تھے۔ چونکہ عربی و فارسی اُس کی گھٹی میں رس بس گئی تھی، جماعت میں سبقت لے جانا اُس کے لیے آسان تھا۔ محنت و مشقت کی ضرورت نہ تھی۔ جب کہ دیگر ہم جماعت صبح و شام کتابوں میں گڑے نظر آتے تھے، وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا کہ یونیورسٹی

ایک چمنستان ہے۔ایک ہی غنچہ پر جان نہ چھڑکو۔سارے باغ کی خوب سیر کرو۔زندگی کا یہ زریں موقع ہے۔اس سے خوب لطف اٹھاؤ۔کتابوں کے کیڑے نہ بنو۔صحیح انسانیت کا سبق سیکھو۔دوستی و مروت کو آگے بڑھاؤ۔خوش خلقی و خوش مزاجی سے ماحول میں ایک نیا رنگ جما دو۔علم کے جوہر کو اخذ کرو۔تفصیلات میں نہ پھنسو۔زیادہ سوچو، سمجھو اور صرف طوطے کی طرح رٹنا چھوڑ دو۔یہ تھا اس نونہار طالب علم کا شعار۔

اس آسان طبعی کے باوجود جب کبھی مقابلہ کا موقع آتا تو میدان ہمیشہ اسی کے ہاتھ رہتا۔استاد کے منھ سے ابھی سوال ختم نہ ہو پاتا، جواب دے دیا جاتا۔ہم سب ہکّا بکّا رہ جاتے۔شعبہ اردو کے صدر، ہمارے استاد محترم پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب تھے، اردو سے انگریزی میں اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی کلاس انتہائی لطف اندوز ہوتی تھی۔کلاس میں کسی کی سکت نہ تھی کہ میر محمود حسین کا مقابلہ کرے۔سب سے پہلے، سب سے عمدہ اور سب سے صحیح و پاک صاف

ترجمہ آپ ہی کا ہوتا تھا۔ سروری صاحب کی مسرت کی انتہا نہ رہتی۔ کبھی کبھی بحث چھڑ جاتی کہ فلاں لفظ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ میٹھی تکرار یہاں تک پہنچ جاتی کہ سروری صاحب کو ہی کہنا پڑتا " ارے میاں، جانے دو، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے "۔

مزا تو اُس وقت آتا تھا جب کہ ہماری اُردو ٹیکسٹ "تائیس"، جو فرانس کے مشہور افسانہ نویس، اناطول فرانس کی تصنیف تھی، کلاس میں پڑھائی جاتی تھی۔ اُس کے سرورق پر لکھا گیا تھا۔

" زاہد غرور داشت، سلامت نبرد راہ
رِند از رہِ نیاز بدار السلام رفت "

یہ ایک رومانی ناول تھا۔ اور ہمارے استاد محترم پروفیسر ایچ۔ آر۔ عبدالمجید صاحب تھے۔ اِس کتاب کے کئی حصّے ایسے تھے جو نوجوانوں کو تفریح ہی نہیں بلکہ شوق پر اُکسا دیتے تھے۔ ہمارے ایک اور ہم جماعت خلیل الرحمٰن صاحب تھے جو بعد میں میجر ہو گئے تھے۔ بفضل تعالیٰ بقیدِ حیات ہیں، رومانی حصّوں کی تشریح میں

ضرورت سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے، مگر میر محمود حسین صاحب کا مقابلہ کون کرے؟ مولنا اور میجر صاحب میں جنگ چھڑ جاتی۔ دونوں اُردو کے میدان کے شہسوار تھے اور کوئی یہ نہ چاہتا تھا کہ پیچھے ہٹے۔ شور و غل سے یوں معلوم ہوتا کہ چھت گر پڑے گی۔ اُردو کلاس کے پانچ سات لڑکے کالج کے ہزار دو ہزار پر بھاری تھے۔ اگر میر محمود حسین میر کارواں تھے تو میجر خلیل سپہ سالار اعظم۔ مگر بحث و تکرار اس قسم کی ہوتی کہ شرافت و نفاست کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹتی۔ معیار بلند ہوتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ انیس و دبیر کا مقابلہ ہے۔

غرض کالج میں مولنا کی صحبت یاروں کے لیے مسرت کا سرچشمہ بن جاتی تھی۔ وہ اپنی ظرافت، خوش مزاجی و ملنساری سے سبھوں کا دل موہ لیتے تھے۔ ان کے لطیفے، چٹکلے، ہنسی، مذاق، شوخی اور ایک خاص قسم کے شیریں قہقہے، انھیں ہیرو بنا دیتے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی جاذبیت تھی جو انھیں انفرادیت بخشنے کے علاوہ ساری فضا کو معطر بنا دیتی تھی۔ بحث و مباحثہ

زیادہ تر علمی نہ ہوتا بلکہ سماجی زندگی کی اُن کمزوریوں پر ہوتا تھا جس کے ہم شکار ہو چکے تھے۔ اُن کی نظر بہت دوررس تھی اور انھیں افراد کے کردار کی جانچ میں کمال کی مہارت حاصل تھی۔ اُن کی قربت سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ بغیر کوشش کے ہر شخص کو ایک وسیع حلقے کے ظاہر و باطن کی ایک عمدہ رپورٹ مل جاتی تھی۔ یوں کہیے کہ ہماری اندرونی بیماریوں کا ایک عکسی فوٹو۔ ادیب کا کام زندگی کی جانچ ہے اور وہ اِس کام کے ماہر تھے۔

خوش قسمتی سے اُس زمانے میں روزگار کے لیے اِتنی دوڑ دھوپ کرنی نہ پڑتی تھی جتنی کہ آج۔ میرا اور مولٰنا کا طالب العلمی کا زمانہ ساتھ ساتھ ہی گزرا اور جب ملازمت کی تلاش رہی تو ہم دونوں کم و بیش ایک ہی ساتھ اپنی ہی یونیورسٹی میں لکچرار بن گئے۔ اُس زمانے میں یونیورسٹی کی ساری اعلا تعلیم مہاراجہ کالج میں ہوتی تھی اور گنگوتری کا ابھی وجود بھی نہیں ہوا تھا۔ مہاراجہ کالج کا معیار شہرہ آفاق حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں یوروپی اسٹاف بھی تھا اور ہندستانی بھی۔ رادھاکرشنن، کے۔ ٹی شا،

سی۔آر۔ریڈی ؛ اے۔آر۔واڈیا ؛ ین۔یس۔سُبّا راؤ؛ ایم۔وی۔گوپال سوامی؛ وی۔یل۔ڈی سوزا اور عباس شوستری جیسے جید عالم اس یونیورسٹی کو چار چاند لگانے میں مشغول تھے۔یہاں ملازمت پانا قدرت سے فوزِ عظیم حاصل کرنے کے مترادف تھا۔یہاں کی یونین آکسفورڈ وکیمبرج کے یونین کا مقابلہ کرتی تھی۔اُس کے سکرٹری کی توقیر آج کل کے وزیروں سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ اُن کے لیے گاندھی جی یا نہرو یا جناح یا وائسرائے کو دعوت دینا اور اُن کی تقریروں کا انتظام کرنا معمولی بات تھی۔کیا مجال کہ دنیا کی کوئی بھی عظیم ہستی میسور آئے اور مہاراجہ کالج کے درشن کیے بغیر چلی جائے، چاہے وہ چو۔ین لائی ہو یا سٹافورڈ کرپس ہو یا پیتھک لارنس ہو یا ٹائینبی ہو۔ ہونہار نوجوان سِول سروس کی ملازمت کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر یہاں کی لکچررشپ کو ترجیح دیتے تھے۔ایسے ایسے عالم، خطیب، محقق ومفکر یہاں جمع تھے جو کسی بھی ملک وقوم کے لیے مایۂ ناز بن سکتے ہیں۔ مولٰنا کے والد بزرگوار بھی اِسی کالج کے ایک معزز

استاد رہ چکے تھے اور مولنا کو انھیں کے فیض سے علم وراثت میں مِل چکا تھا۔

اس کالج کی یہ خاص خصوصیت تھی کہ یہاں تعلیم سے زیادہ تربیت پر زور دیا جاتا تھا۔ یہاں علم کے جوہر کو اخذ کرنے کا سلیقہ سکھایا جاتا تھا۔ یہاں ہر فرد کو انسانیت کا سبق دیا جاتا تھا۔ یہاں اخلاقی شخصیت کی تعمیر ہوتی تھی۔ ادب وتمیز، صدق وصفائی، دوستی و ملنساری، اتحاد واتفاق، رواداری و خلوص، حق گوئی و بے باکی، یہاں کی تعلیم کا نصب العین تھا۔ حوادث کے تھپیڑوں سے نپٹ کر کشتی کو ساحل سے لگانے کا طریقہ سکھانا یہاں کا اصول تھا۔ انسانی قدروں کی جانچ، ہماری ملی جلی ہندستانی تہذیب وتمدن کی حفاظت، وطن سے محبت اور ہم وطنوں سے برادر سلوک یہاں کے درس وتدریس کا مقصد تھا۔

مولانا نے صرف عربی وفارسی میں ہی کمال کی استعداد حاصل نہ کی تھی بلکہ اس یونیورسٹی کی اصلی روح اُن میں کارفرما تھی۔ اس لیے وہ ایم۔ اے کے بعد فرید ڈگریوں

کے چکر میں نہ پھنسے۔ جو کچھ پڑھا تھا، سیکھا تھا، اُس کو
جانچنے، سمجھنے میں، اور جو کچھ جانتے تھے اس کو اوروں
تک پہنچانے میں اپنی ساری زندگی صرف کر دی۔ مولٰنا
کا یہ اصول تھا کہ جو بھی کام کرو، جوش وخروش سے
کرو۔ اس کو انتہائی کمال تک پہنچاؤ اور جب تک کام
پورا نہ ہو، دم نہ لو۔ زمانہ دراز تک وہ اُردو، عربی،
فارسی شعبہ کے روح رواں رہے۔ یہاں انھیں کئی
کام انجام دینا پڑتے تھے اور وہ ہر کام کو خوب صورتی
سے انجام تک پہنچا دیتے تھے۔ کالج کا میگزین اگر
نکلتا تو اتنا شاندار کہ اس میں کسی بات کی بھی کمی نہ ہو پاتی۔
کئی جلسے وتقاریب منعقد ہوئے اور اِس خوبی سے انجام
پاتے کہ ہر شخص داد دیے بغیر نہ رہتا۔ اُردو شعبہ کے
ڈرامے مشہور تھے اور مولٰنا اِن کے میعار کو بلند رکھنے
میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ ریاست بھر میں جتنے فارسی
کتبے تاریخی عمارات میں لگے ہیں اُن کو نقل کرنے کا اور
شایع کرنے کا منصوبہ اُنھوں نے ہی بنایا تھا۔ اِس منصوبے
کو جس ذوق وشوق و پھرتی سے انھوں نے پورا کیا ہم سب

کے لیے باعث تقلید ہے۔ وہ اس کام میں ایسے منہمک رہے گویا میدانِ جنگ انھیں جیتنا ہے۔ ایک مرتبہ خاکسار سے کہا کہ ہم دونوں کو ریاست بھر کا دورہ کرنا چاہیئے اور جتنے بھی فارسی یا عربی قلمی نسخے یا مخطوطات، یا فرمان یا کسی بھی قسم کا علمی مواد جو ہماری تہذیب و تاریخ سے تعلق رکھتا ہو، اکھٹا کرنا چاہیئے اور اس کو یونیورسٹی کے اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں منتقل کر کے آیندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دینا چاہیئے۔ اُن کی مستعدی اور جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ ایک قلیل مدت میں ہی ہم دونوں نے بیسیوں قلمی نسخوں کا سراغ لگایا اور اُنھیں حاصل کر کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے حوالے کر دیا۔ یہ ایک معرکۃ الآرا کام تھا جو اُنھوں نے انجام دیا۔

ٹیپو سلطان شہید ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے جب وہ نگراں بنے تو اس کو قومی و بین الاقوامی شہرت کے قابل بنانے میں مصروف رہے۔ حیدر علی خاں بہادر اور سلطان شہید پر جس قدر بھی مواد مل سکتا تھا سب جمع کیا۔

ایک عمدہ لائبریری کی بنیاد ڈالی اور تحقیق و تفتیش کا سامان مہیا کیا۔ یہاں انھوں نے ہر سال ایک خاص نمبر شایع کرنے کی روایت قایم کی اور ہر نمبر معیاری ہوتا تھا جس میں ملک کے ماہر مؤرخ و محقق اپنی تحقیقات پیش کرتے۔ یہ جلدیں آج بھی کافی معلومات کا ذخیرہ ہیں۔ اس کے لیے انھیں کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی کیونکہ ملک کے مختلف مقامات سے مختلف ماہروں سے مضامین حاصل کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اُن کی بزرگی، دلچسپی، اور طرز خطابت سے ہر شخص مرعوب ہو کر دل و جان سے اُن کے کام میں شریک ہو جاتا۔ یہ سارے نمبر اس خوب صورتی سے شائع ہوئے ہیں کہ ہم اُن کے جمالیاتی ذوق کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ افسوس کہ اُن کے بعد ایک نمبر بھی اس معیار کا نہ نکلا۔

مولانا کی کئی تصانیف ہیں۔ وہ سب یوں وجود میں آئیں کہ اُن کے ذہن میں ایک بات آئی اور وہ چند ہفتوں میں عملی جامہ پہن کر منظر عام پر آ گئی۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ ایک ہی چیز کے پیچھے کئی کئی مہینے لگ گئے اور وہ یہ کہتے

رہے کہ کام ہورہا ہے، ہورہا ہے" طبیعت میں غضب کی پھرتی تھی اور برق کی تیزی۔ جو بھی منصوبہ بناتے پورا کرکے دکھاتے تھے۔ بولتے کم تھے، کرتے زیادہ۔ جب قلم ہاتھ میں لیتے تو الکٹرانک ٹائپ رائٹر کی تیزی سے، اسی کی خوب صورتی کے معیار پر، صفحۂ قرطاس اُن کے عقل و شعور کے موتی رولتا تھا۔ کیا مجال کہ کہیں سے کچھ کاٹا ہو، خوشخط ایسا کہ خوشنویس شرما جائیں اور کاتب تھرا جائیں۔ بحث و مباحثہ میں بیٹھتے تو خیالات کی پختگی اور دلایل کی صحت سے اپنی بات منواتے۔ بڑے شریف النفس انسان تھے۔ اُن کی محبت و مروت بے مثال تھی۔ اُن کے دوستوں کا حلقہ وسیع تھا۔ جس کسی کو بھی چاہا، دل و جان سے چاہا۔ کوئی اُن کی نظر سے گرا تو اُس کی شامت آئی۔ دوستی بھی گہری اور دشمنی بھی گہری۔ کسی سے کچھ وعدہ کیا تو پکا رہا۔ کیا مجال کہ قیامت آنے پر بھی وہ ٹوٹے۔ دوست احباب اور خاص کر شاگردوں کا جمگھٹا ایسا ہوتا کہ جیسے ایک دربار لگا ہے اور وہ اُن کی قسمتوں کا فیصلہ سنا رہے ہیں۔ غرض وہ ایک نادر شخصیت تھی جس کا فیض عام تھا۔

آخر میں ایک سوال یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ علوم مشرقیہ سے، جس کے ماہر مولٰنا تھے، ہم کیا سبق سیکھ سکتے ہیں؟ چند الفاظ میں اُس کی گنتی یوں ہو سکتی ہے۔

(۱) خدا بینی، جہاں بینی، خود بینی ــــ اُن حقائق پر تفکر۔

(۲) علم الیقین، عین الیقین و حق الیقین ــــ ان ایقان پر تدبر۔

(۳) نفس امارہ، نفس لوامہ و نفس مطمئنہ ــــ اِن مراحل کی جانچ۔

(۴) اعلائے کلمۃ الحق، تحصیل علم و کسب معاش ــــ اِن امور کی تعمیل۔ (۵) تخلیق، ترکیب، تحلیل ــــ اِن مسائل کی تشریح۔

(۶) تغیر، ترقی، تنزل۔ اِن مدارج کی توضیح۔ اِن پر سیر حاصل بحث کے لیے کئی جلدیں چاہئیں۔ اِن پر ہمارے علمائے کرام صدہا سال روشنی ڈالتے چلے آئے ہیں۔ یہ احتساب کائنات ہے، احکام الٰہی کا خلاصہ ہے، ارشاداتِ نبوی کا نچوڑ ہے۔ انسانی زندگی کا اثاثہ ہے اور ہمارے علوم و فنون کی روح ہے۔ اسلام میں عالم کا مقام زاہد کے مقام سے بھی اونچا ہے۔ زندگی کے طوفان میں زاہد خود اپنے آپ کو بچاتا ہے اور اپنی جنت پکی کرتا ہے۔ لیکن عالم اس طوفان میں دوسروں کو بچاتا ہے اور ظلمت

سے روشنی کی طرف لے آتا ہے۔ یہی اُس کا رختِ سفر ہے۔ سفر تبدیلی کا نام ہے، ہر وقت حرکت میں رہنے کا نام سفر ہے۔ نئے مقام کو پانے کا نام سفر ہے "سفر زندگی کے لیے برگ و ساز ہے۔ سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز۔" ساری زندگی سفر ہے۔ طفلی سے بچپن، بچپن سے جوانی، جوانی سے بڑھاپا اور بڑھاپے سے لحد، سبھی سفر ہے۔ ہر جگہ سفر، ہر حال میں سفر اور ہر وقت سفر۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو رختِ سفر باندھتے ہیں۔ یہ رختِ سفر کیا ہے؟ تلاشِ حق، جس سے انسان امر ہو جاتا ہے۔ فنا سے بقا میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ہمیشہ جاوید رہتا ہے۔ مولانا بھی سفر کر چکے، نئے مقام کو پا چکے، تلاشِ حق اپنا رختِ سفر باندھ چکے اور ہمارے لیے تین چیزیں چھوڑ گئے، اوصافِ حمیدہ، صالح اولاد اور نیکی کے نقوش۔ ہمارا عمر بھر کا دوست اب نہ رہا، لیکن اُس مخلص دوست کی تلاشِ حق، فقر و غِنا، و علم و فضل کی خوشبو، گلاب کی مہکتی پنکھڑی کی طرح آج بھی فضا کو معطر کیے ہوئے ہے۔

اسلام میں اعلا اقدار کی اہمیت

ملتِ اسلامیہ اس دور میں کن نازک حالات سے گزر رہی ہے وہ اُس ملت کے سبھی صاحبانِ ذی شعور پر بہ خوبی عیاں ہے۔ اس کے تدارک میں کئی تجویزیں پیش کی جا رہی ہیں۔ تعلیمی صورت بہتر بنائی جائے، سیاسی شعور اُبھارا جائے، اخلاقی حالت سدھاری جائے، معاشی ذرائع وسیع کیے جائیں، سماجی کمزوریاں دور کی جائیں، اسرافات، خرافات، توہمات اور آپسی اختلافات کا سدِّ باب کیا جائے، وغیرہ وغیرہ۔ اِن سب کے علاوہ ایک اور تجویزیہ ہے کہ ہمارے شاندار ماضی کی اُن اعلا اقدار کو پھر سے اُجاگر کیا جائے جن کی وجہ سے ملت اسلامیہ آفتاب کی طرح چمک اُٹھی تھی۔ مسلمانوں کو اسلام کے صحیح اصولوں

پر چلنے کی وجہ سے عزت و عظمت ملی تھی اور اُن اصولوں سے غفلت کی وجہ سے وہ قعرِ مذلت میں گر پڑے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سمجھیں اور عمل کریں کہ وہ اعلا اقدار کیا تھے۔

سب سے پہلے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام آدم کے وجود سے چلا آرہا ہے۔ نوح علیہ السّلام نے بھی اُس کی تبلیغ کی تھی، حضرت ابراہیم، اسمٰعیل یعقوب، ادریس، الیاس، داؤد، سلیمان، موسیٰ و عیسیٰ علیہ السّلام نے بھی۔ ہر زمانے میں اِس مذہب کی اعلا اقدار کو توڑا موڑا گیا تو ہدایت کے نور کو پھر سے بھڑکایا گیا۔ ہادیٔ و رسول آتے گئے اور اپنا پیغام پہنچاتے گئے۔ یہ نبیوں و پیغمبروں کو بھیجنے کا سلسلہ آدم کی آمد سے چودہ سو سال قبل تک برابر جاری رہا۔ حتیٰ کہ قدرت کو یہ بات پسند آئی کہ یہ سلسلہ اب ختم کرو، ایک آخری نبی و رسول بھیجو، جو خاتم النبین ہو اور اُس کے بعد رسالت کا دروازہ بند کر دو۔ یہ آخری پیغمبر، ہمارے آقا رسول اکرمؐ تھے جنھوں نے پچھلے تمام پیغمبروں کی تعلیمات کا نچوڑ ہی پیش نہ کیا بلکہ دین اسلام کو مکمل بھی کر دیا،

صالح نظامِ زندگی کے اصول بتائے ۔ رازِ حیات کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ۔ کائنات کے ربط وضبط کی سبھی حقیقتوں کو واضح کیا ۔ قدرت کے قانون سمجھائے ۔ فطرت کے آئین بتلائے اور خالق کے پیغام کو پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ۔ ہدایات کا سرچشمہ قرآن پاک عطا کیا ، اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھا کہ دیکھو صالح زندگی کیا ہوتی ہے اور اپنے ارشادات کا وہ وسیع وعمیق سمندر ہمیں عطا کیا جو احادیث نبوی کے نام سے موسوم ہے ۔ اِن سب میں وہ اعلا اقدار موجود ہیں جو اسلام سے عبارت ہیں ۔ گویا مذہب اسلام کا دوسرا نام ہے وہ اعلا اقدار ...... جو آدم کی سرشت سے پیوستہ ہیں ۔

اس لیے مذہب اسلام کو حدود میں معین کرنے کی ضرورت نہیں ۔ ہمارا دعوا ہے ہر اچھی سچی ، نیک ، صالح ، ومفید بات اسلام سے منسلک ہے اور ہر وہ بات جو اس کی ضد ہے اسلام کے خلاف ہے ۔ اس لیے اسلام کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ مشکل یہ آپڑی ہے کہ اغیار کو نہیں اپنوں کو اپنے اقدار کیسے سمجھائیں ؟ یہ اقدار ایک دو نہیں جس کی فہرست تیار کی جائے ، بلکہ یہ ایک نظامِ حیات

ہے جو پیدائش سے رحلت تک ہمارے سب ہی حرکات و سکنات پر قابض ہے۔ پھر بھی مثال کے طور پر یہاں چند کا ذکر کیا جائے گا۔ اولاً یہ کہ اسلام کا انقلابی پیغام وحدت ہے، خالق کی وحدت اور خلقت کی وحدت، اگر بنی نوع انسان صرف اس ایک پیغام کے صحیح مفہوم کو سمجھ جائے تو یہ دنیا فردوس بن جائیں گی۔ آپس کے سبھی اختلاف دور ہو جائیں گے اور ساری خلقت انسانیت کے زیور سے مزین ہو جائے گی۔ وہ سبھی تخلیق کی بنیاد ہے، ہر بشر ایک باپ کی اولاد، ہر شجر ایک بیج کا محتاج، ہر مرغ و ماہی کا وحدت سے ہی وجود۔ جہاں دوئی پیدا ہوئی فساد پیدا ہوتا ہے، ایک گھر کے دو مالک ہوں تو جھگڑا، ایک ملک کے دو حاکم ہوں، تو جھگڑا، چونکہ آج کل مسلمان فرقوں میں بٹ گئے ہیں مصیبتوں کا شکار بن گئے ہیں۔ یہ اگر متفق ہو جائیں تو کوئی طاقت اِنھیں زیر نہیں کر سکتی۔ اِس ملک پر انگریزوں کا قبضہ اِس لیے ہوا کہ یہاں میر جعفر اور میر صادق کی کمی نہیں تھی جنھوں نے چند کلیوں کے لیے سارا چمن بیچ ڈالا۔ اگر سارے عرب ایک ہوں تو یہودی بلبلا اٹھیں گے۔ وحدانیت کا سبق اگر مسلمان سیکھ

جاتے تو نہ ایران، عراق میں جنگ ہوتی، اور نہ عراق و کویت میں۔ نہ ہندوستان بٹتا اور نہ پاکستان کٹتا۔ کرۂ ارض کے سبھی مسائل فرزندِ آدم کی وحدت کو بھول بیٹھنے کی وجہ سے ابل رہے ہیں ؎ "ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے:
قیامت ہے کہ انسان نوعِ انساں کا شکاری ہے"۔ اس لیے اتحاد و اتفاق، اور وحدانیت کا جذبہ سب سے اہم ہے۔

اسی وحدانیت کے سرچشمے سے کئی دیگر اقدار ظہور میں آتے ہیں۔ اخوت، مروت، حمیت، برادری، حق و انصاف، سبھی و   کے گرد گھومتے ہیں۔ عشق و محبت کی سرگوشیاں اور راز و نیاز کی سرمستیاں سبھی وحدت سے وابستہ ہیں۔ خالق کی وحدت کی کیفیت قلب پر گزرے تو حقیقت کے پردے فاش ہوتے ہیں اور اگر خلقت کی وحدت کا اثر دل پر گزرے تو مقصدِ حیات کے معنی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اِس ساری کائنات نے انسان کے لیے تخلیق پائی، اور انسان کی تخلیق اس لیے کہ وہ دوسرے انسان کے کام آئے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں ؎

تکمیل بشر نہیں ہے سلطان ہونا
یا صف میں فرشتوں نمایاں ہونا

تکمیل بشر ہے عجز بندگی کا احساس
انسان کی معراج ہے انسان ہونا

اس لیے اعلا اقدار میں وحدت سے لگی ہوئی دوسری اہم قدر خدمت خلق ہے "یہی ہے عبادت، یہی دین وایمان۔ کہ کام آئے دنیا میں انسان کے انسان"۔ جب تک مسلمان صرف اپنی ذات کے لیے زندہ ہے، وہ کبھی سرخروئی حاصل نہ کرے گا۔ قانونِ قدرت ہے کہ دنیا کی ہر شے کسی اور شئے کے لیے ہے، خود کے لیے نہیں۔ اگر مسلمان بھی "میں" کے دائرے سے نکل کر "ہم" کے زمرے میں شریک ہو تو حالت بدل سکتی ہے۔ ذاتی مفاد ہٹ کر قومی مفاد کا خیال رکھے تو حالت بدل سکتی ہے۔ صرف لینا ہی نہیں دینا بھی سیکھ جائے تو حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ صرف جینا ہی نہیں مرنا بھی سیکھ جائے تو حالت بدل سکتی ہے۔ ایثار و قربانی کے بغیر کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ جو قوم اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہمیشہ اصول و اقدار پر سر تسلیم خم کرتی ہے، وہ بام عروج پر پہنچتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام نے یہ کر دکھایا تھا۔ ہماری ہی ریاست میں سلطان شہیدؒ کی مثال موجود ہے۔ جن کے متعلق علامہ اقبالؔ نے کہا "عشق رازے بود بر صحرا نہاد"

تو نہ دانی جان چہ مشتاقانہ داد"، عشق ایک پوشیدہ راز تھا جو سلطان نے سارے عالم پر عیاں کر دیا، اور تم نہیں جانتے کہ اس نے اپنی عزیز جان کس شوق و اشتیاق سے اس سرزمین کی خاک پر نچھاور کر دیا۔" کیوں نہ ہو غیرت گلزار وہ کوچہ خدا نے: لہو جس خاک پر کن کن عزیزوں کا گرا ہوگا"۔ جب تک مسلمان ایثار و قربانی کے معنی نہیں سمجھ سکتا، " اشک خونین " کے مفہوم تک نہیں پہنچتا، " مثالِ گُل، وضو خون سے ہو" کے مطلب کو نہیں پاتا، وہ غیرت و عزت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

ایثار و قربانی شہادت کے مرتبہ کو ہی نہیں کہتے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر مسلمان " وارث جذبہ حسین " سے سرشار رہے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو بھائی سمجھے، اس کے دُکھ درد کا خیال رکھے، اس کی مدد کرے اپنی دولت کو اللہ کی امانت سمجھ کر ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرے، اپنی سمجھ بوجھ، صلاحیت و قابلیت سے دوسروں کو فیض پہنچائے، نرمی و اخلاق سے سبھوں کے دل موہ لے۔ محبت و مروت، خدمت خلق، و اوصاف حمیدہ سے اسلام کی شان بڑھائے۔ اس کے لیے میدانِ جنگ میں جان دینے سے بھی

زیادہ جرأت کی ضرورت ہے۔ یہ جسمانی جرأت نہیں، اخلاقی جرأت ہے، انسانی جرأت ہے، روحانی جرأت ہے، یہاں نفس امارہ کو مارنا ہوگا، نفس لوامہ سے نفس مطمئنہ تک پہنچنا ہوگا۔ یہاں ضبط نفس کی ضرورت ہے۔ یہاں تسلیم ورضا، طاعت وعجز بندگی کا احساس ضروری ہوگا۔ یہاں خود شناسی، خدا شناسی، اور جہاں شناسی کی ضرورت پڑے گی۔ یہاں ذات قدوس کے جلال وجمال وکمال کے معنی سمجھنا پڑیں گے، یہاں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کو پانا ہوگا، یہاں صبر وشکر وفقر کو ہاتھ سے جانے نہ دینا ہوگا، یہاں ایمان، اسلام، احسان پر ثابت قدم رہنا ہوگا۔ یہاں تلاش حق، تحصیل علم اور خدمت خلق کو ہاتھ سے جانے نہ دینا ہوگا۔ غرض اسلام ہے نام ان اعلا اقدار کے مرکب کا جس سے انسان کامل بنتا ہے۔

ایک اور اہم جوہر جو اقدار میں شامل ہے، وہ قوت ہے۔ کمزور انسان خوش نہیں رہ سکتا۔ جسم کے اعضا کمزور ہو جائیں تو موت دور نہیں۔ انسان کی ترقی ہر قسم کی قوت و طاقت و مضبوطی میں مضمر ہے۔ صرف جسمانی قوت ہی نہیں بلکہ علمی، عملی، اخلاقی، روحانی، ذہنی، ایجادی، اختراعی و تخلیقی،

قوت بھی۔ انسان جو بھی کرے ولولہ، جوش وخروش، ہمت وحوصلہ سے کرے جس کے لیے طاقت کی ضرورت ہے۔ جرمن فلسفی نطشے قوت کے فلسفہ کا امام ہے، جس کی وجہ جرمن قوم انسانی تاریخ میں ایک انقلابی دور کے آغاز کا باعث بنی، لیکن یہ فلسفہ جبر، تشدد، ظلم، سخت گیری، اقتدار واستبداد کو روا تصوّر کرتا ہے، اور طاقت کو نیکی اور کمزوری کو گناہ سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی قوت وطاقت، اخلاق شخصیت کے تعمیر کے حق میں ہے۔ شر کو مٹانے کے حق میں ہے، خیر کو بڑھانے کے حق میں ہے، اور ساری انسانیت کو نیکی وبھلائی، حق وانصاف، محبت ومروت اور امن وآشتی کی زندگی کے لیے مواقع فراہم کرنے کے حق میں ہے، اس کے لیے بھی قوت چاہیئے۔ غرض لاتعداد اسلامی اقدار کے خزانے میں خالق کی وحدت، قانون کی اطاعت اور عمل کی قوت اہم جواہر ریزے ہیں۔

شہادت کا فلسفہ

قدرت کا سارا نظام اصولوں کے تابع ہے۔ وہی یادگار باقی رہیں گے جو خون و پسینہ سے سینچے گئے ہوں۔ وہی چیز فوزِ عظیم کی حامل ہوگی جو جان دے کر حاصل کی گئی ہو۔ وہی قوم و ملت صحیح زندگی کا ثبوت دے گی جس میں اصولوں کے لیے جان دینے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہو، چاہے وہ اصول حق و صداقت کے ہوں، یا خود بینی، جہاں بینی یا خدا بینی کے ہوں، یا ایمانداری یا خدمت خلق یا تلاشِ حق کے ہوں، یا اوصاف حمیدہ یا صبر و شکر و فقر کے ہوں، یا علم و حکمت و قوت و اقتدار کے ہوں۔ جہاں وہ چیز اعلائے کلمۃ الحق اور اخلاقی اقدار سے مطابقت رکھتی ہو۔ اور اگر ایسی چیز کے حصول کے لیے جان کی بازی لگا دی

جاتی ہے، وہاں قدرت کا قانون ہے کہ سچی زندگی کی روح بخشی جاتی ہے۔ اسی لیے مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا:۔
"قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے ÷ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"

شہیدوں کا درجہ اس لیے بلند ہے کہ وہ اپنی جان سے دوسروں کی زندگی خریدتے ہیں۔ بشر کی جان سے بڑھ کر اس کائنات میں اور کیا شے ہو سکتی ہے؟ جب اِس شے کی قربانی پر انسان اُتر آتا ہے تو ظاہر ہے کہ شہید کا رتبہ اعلا وارفع مقام پر ہی ہوگا۔ اِس کائنات میں خالق کی طرف سے صرف حُسن وجمال کی تخلیق ہوئی تھی۔ علم وحکمت کے چشمے رواں دواں تھے۔ خیر وبرکت کا نظام مہیا تھا۔ اور قدرت چاہتی تھی کہ انسانوں میں بھی عجز وبندگی، اخوت وبرادری، ہمدردی و انسانیت اور محبت ومروت کا جوہر ابھرے۔ اُس کے برعکس ناشکری وبے صبری، حرص وہوس، ظلم وستم، حق تلفی، وسفاکی، کفر والحاد کا زہر اِس کائنات کے پاکیزہ شیرازہ میں۔ جب انسان کی طرف سے داخل ہونا شروع ہوگیا تو قدرت کے خلاف یہ جنگ تھی اور اُس کی روک تھام ضروری بن

گئی۔ جب کوئی نیک بندہ، مرد مجاہد کا روپ سامنے آتا ہے اور فی سبیل اللہ اِس میدانِ کارزار میں کود پڑتا ہے اور اپنی جان دے کر حق و صداقت کا پرچم بلند کرتا ہے۔ تو اُس کا مقام خواب قوسین کی بلندیوں تک پہنچ جائے گا۔

اُس قسم کی شہادت عظیم کی ایک نادر مثال تاریخ اسلام میں ہمیں ملتی ہے جب کہ سید الشہدا حضرت امام حسین نے راہِ حق میں اپنا سر کٹایا تھا۔ اسلامی سال کا پہلا مہینہ انہیں کی یاد سے شروع ہوتا ہے اور ایسی ہی عظیم ایثار و قربانی کا درس دیتے ہوئے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے منسلک ہے، ختم ہوتا ہے۔ گویا مذہب اسلام کی ابتدا و انتہا شہادت ہے۔ گویا راہِ حق میں خود کو مٹانا عین سعادت ہے۔ گویا زیست کا حاصل قربِ الٰہی کے شوق میں مر مٹنا ہے۔ گویا زندگی کا دوسرا نام جد و جہد ہے جہاں مالک کی امانت مالک کے حضور پیش کرنے میں سبقت بندگی کی معراج ہے۔ گویا مردِ مومن ایک مجاہد ہے جو ہر وقت میدانِ جنگ میں کود پڑنے کے لیے تیار رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا بندہ ہر وقت خوشنودئ خداوندی کا حقدار

رہے گا۔

ایک سوال یہاں یہ اٹھتا ہے کہ قدرت کو یہ کیوں پسند ہے کہ خالق کی بخشی ہوئی جان کی قربانی سے ہی قوموں کا مستقبل بنے۔ اس لیے کہ ہر عظیم شے کے لیے عظیم قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ کیڑے مکوڑوں کی زندگی بسر کرنا ہو تو ایثار و قربانی ضروری نہیں۔ لیکن شیر و شاہین کی زندگی مقصود ہو تو اُس کے لیے جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ موتی سمندر کی سطح پر نہیں سمندر کی تہہ میں دستیاب ہوتے ہیں۔ ابرباراں پستیوں سے نہیں، بلندیوں سے برستے ہیں۔ کوثر و تسنیم کے چشمے خدا کے منکروں کو نہیں شہیدوں و عارفوں کو ہی نصیب ہوتے ہیں۔ قدرت کے راز انسان اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہر وقت رضائے الٰہی کے سراغ میں سرگرداں نہیں رہتا۔ کسی ایک کی کاوش سے، شجاعت و بہادری سے، شہادت و قربانی سے میدانِ جنگ کی کایا پلٹ سکتی ہے اور قوموں کی قسمت کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ جو بندہ اس قربانی کے لیے پیش قدمی کرتا ہے وہ مقبول الٰہی بن جاتا ہے۔ ٹیپو سلطان شہید کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال

فرماتے ہیں ؎

نامش از خورشید و مہ تابندہ تر
خاک قبرش از من و تو زندہ تر

اس کے نام سے چاند اور سورج سے زیادہ نور برستا ہے۔ اور اُس کی قبر کی خاک میرے اور تیرے جیسے بقید حیات لوگوں سے زیادہ زندہ ہے۔ جو لوگ باطل کا مقابلہ کرنا اپنی زندگی کا مقصد قرار دیتے ہیں اور اُس مقصد عظیم کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں، اُن پر ہمیشہ رحمتِ الٰہی کا نور برستا رہے گا۔

شہادت کا ایک گہرا فلسفہ ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے علامہ اقبال نے اپنے "جاوید نامہ" میں سلطان شہید کی مثال سے کمال کی حد تک غائرانہ روشنی ڈالی ہے۔ جب تک انسان والہانہ انداز میں موت سے ہم آغوش نہیں ہوتا، اُس کا نام عاشقوں کی فہرست میں درج نہیں کیا جاتا۔ "عشق را زے بود بر صحرا نہاد ؎ تو نہ دانی جان چہ مشتاقانہ داد"۔ عشق ایک راز ہے جو شہید کے خون سے فاش کیا جا سکتا ہے۔ افراد، اشیا اور قدرت کی ہر تخلیق شدہ شئے، یہ سب

رو دِحیات کی موجیں ہیں۔ اِن کی حقیقت دریا کی لہروں سے بڑھ کر نہیں۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ ہر گھڑی انقلاب میں پھنسی رہے۔ کائنات میں تبدیلی ہی اصل چیز ہے۔ ہر موجود کی بنیاد فنا پر رکھی گئی ہے۔ ہر موجود فنا کی راہ پر گامزن ہے۔ آج ہے کل نہ ہوگا۔ انسان ہو یا حیوان، چرند ہو یا پرند، باغ ہو یا بہار، جو کچھ بھی نظر آتا ہے، فانی ہے۔ باغ میں جو پھول آج شگفتہ ہے، کل مرجھا جائے گا۔ آج کی جوانی کل کے بڑھاپے میں بدل جائے گی۔ دنیا کی ہر دلفریب شئے، ہر دلفریب منظر فانی ہے۔ ہر شئے کا حسن صرف چند روزہ ہے۔ ایسی صورت حال میں حقیقت کیا ہے؟ ؎

حسن رخسار دمے ہست و دمے نیست
حسن کردار و خیالات خوشاں چیزے ہست

جب دنیا سرائے فانی ٹھہری تو انسان کے لیے دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایک تو اس عالم میں آنا ہی نہیں تھا۔ میں وجود میں نہ آتا تو میری روح قدرت کے خزانے میں ہوتی ؎
نہ تھا کچھ تو خدا تھا، نہ ہوتا میں تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہونا نہ ہونا میرے اختیار کی بات نہیں۔ اب جو ہوگیا ہوں تو

اب مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟ یہ دوسری صورت ہے۔ چوں کہ آچکا ہوں تو پھر اپنے وجود کو شرارہ کی طرح بے کار ضایع نہیں کرنا چاہیئے ؟ بلکہ حصولِ مقصد کے لیے کوشش کرنی چاہیئے۔ دنیا کی ہر شے مقصد کے بغیر نہیں، سورج ہو تو روشنی کے لیے، بحر ہو تو موتی کے لیے اور شرر ہو تو وہ کسی کو جلانے کے لیے۔ شرر کو چاہیئے کہ کسی خرمن کو تلاش کرے جس کو جلا کر اپنی خاصیت کا اظہار کرے اور اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرے۔ اسی طرح انسان میں جو جوہر قدرت نے عطا کیے ہیں وہ محل کے گوشے میں آرام پانے کے لیے نہیں بلکہ زندگی کی کشمکش میں حصّہ لے کر قدرت کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے بھی قدرت کے تقاضے کیا ہیں اور وہ انسان سے کیا توقع رکھتی ہے۔ اس کی ہدایات بار بار صحیفوں میں آئی ہے۔

وہ ہدایت شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرنا ہے۔ عالم دانا کی طرح خود بینی، جہاں بینی اور خدا بینی میں لگ کر اسرارِ حیات کا سراغ لگانا ہے۔ ندرتِ فکر و عمل سے اِس کرۂ ارض کو فردوس بریں بنانا ہے۔ میدانِ عمل میں آکر اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا ہے۔ اِس دُنیا میں شاہین کی طرح

زندگی بسر کرنا ہے اور شریفوں کی طرح جان دینا ہے۔ ہر انسان کو اس حقیقت سے آگاہ رہنا چاہیئے کہ زندگی کو زرہ بکتر اور دولت و احتشام سے استحکام نہیں، بلکہ احکام الٰہی کی تعمیل میں استحکام ہے۔ جب انسان اپنی زندگی مرضیٔ مولا کے رنگ میں ڈھال لیتا ہے تو وہ موت سے بے خوف ہو جاتا ہے، وہ موت سے مطلق نہیں ڈرتا۔ وہ شیر بن جاتا ہے اور موت کی حقیقت اس کی نظر میں وہی ہوتی ہے جو شیر کی نگاہ میں ہرن کی ہوتی ہے۔ موت کو اپنی روحانی ترقی کی ایک منزل سمجھتا ہے۔ وہ موت کا اس طرح شکار کرتا ہے جس طرح شاہین کبوتر کا۔ موت خود اس سے ڈرتی ہے۔ اپنی جان ہتھیلی میں رکھے وہ ہر وقت موت کو چیلنج دیتا ہے کہ اگر ہمت ہو تو اُس کو چھینے۔ موت بھی اُس کی زندگی کا ایک حصّہ بن جاتی ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ بقا کے لیے فنا ضروری ہے۔ کسی کے مٹنے سے ہی کسی کی زندگی بنتی ہے۔ کھیتی کٹ کر ہی ہماری غذا بنتی ہے۔ بکری ذبح ہو کر ہی ہمارے لقمہ میں داخل ہوتی ہے۔ موت و حیات کا عجیب فلسفہ ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

شہادت کا فلسفہ اِس بات کا اشارہ ہے کہ مومن کی جنگ محبوب کی طرف ہجرت ہے۔ زندگی ایک سفر ہے۔

سفر زندگی کے لیے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز

جو مزا سفر میں ہے وہ منزل میں نہیں۔ ساری زندگی سفر ہے۔ طفلی سے بچپن سفر، بچپن سے جوانی سفر، جوانی سے بڑھاپا سفر، بڑھاپے سے لحد سفر۔ غریبی سے تونگری سفر۔ جہالت سے دانائی سفر، خوشی سے غمی سفر۔ شام سے صبح سفر اور صبح سے شام سفر، ہر جگہ سفر، ہر حال سفر، ہر وقت سفر، اگر سفر ایسا ہو جس سے بقائے دوام مل جائے اور انسان منزل مقصود پر پہنچ جائے تو ایسے سفر کو لبیک کہنا چاہیئے۔ شہید لوگ ہمیشہ اسی اشتیاق میں رہتے تھے کہ وہ جلد سے جلد عالم بالا کی طرف سفر کر ڈالیں۔ وہ مر کر دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں اور حیات جاوید پاتے ہیں۔ وہ صرف ایک لمحے کے لیے مرتے ہیں اور مرتے ہی فوراً زندہ ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ شہید وہ راہ تلاش کرتے ہیں جس پر موت پکار اٹھتی ہے "تم امر ہو"۔ شہید ہیضہ، فالج اور کینسر کی موت سے دم نہیں توڑتا بلکہ

اپنے گردن کے اُبلتے خون کے فواروں کے ساتھ فوراً اپنے مالک حقیقی سے جا ملتا ہے۔ بجلی کی سرعت کو مانند کر کے آنِ واحد میں نورِ الٰہی کے طبق میں شامل ہو جاتا ہے۔

غرض محرم الحرام کا مہینہ شہیدوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ مومن کے لیے ہر موت شیریں ہے۔ وہ ہر وقت مرنے کے لیے تیار رہتا ہے اور وہ جس رنگ میں آئے، اُسے لبیک کہتا ہے۔ لیکن وہ موت سب سے زیادہ مکرم و محترم اور لائق عزت ہے جو سید الشہدا، امام العاشقین، رئیس الاحرار، حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حصّہ میں آئی۔ اس سے بڑی شہادت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

"یہی ہے پہچان خاصان خدا کی ہر زمانے میں
کہ خوش ہو کر خدا ان کو گرفتارِ بلا کر دے"

اسلامی سائنس کا تاریخی پس منظر

یہاں اسلامی سائنس سے مراد مسلمانوں کے وہ کارنامے ہیں جن سے سائنس عروج میں آئی۔ آج کل سائنس اُن علوم کو کہتے ہیں۔ جن کے حدود مشاہدے، معائنے و مناظرے کے اندر رہوں اور جہاں تخیلی امکانات و احساسات کا دخل نہ ہو۔ موجودہ زمانے میں علم کی شاخوں کی تقسیم ذہنی اعتبار سے دو حصّوں میں کی گئی ہے۔ ایک لسانیات و انسانیات اور دوسرا سائنس و ٹکنالوجی۔ اسلامی علوم اس قسم کی تفریق کے حق میں نہیں۔ وہ سارے علوم کی وحدانیت تسلیم کرتے ہیں۔ اس کو الگ الگ خانوں میں بانٹنا انھیں پسند ان کے پاس سائنس کے لیے خاص لفظ ہی نہیں ہے۔ اگر کسی وجہ یا سہولت کی غرض سے علم کو درجوں یا طبقوں میں تقسیم کرنا ضروری ہی ہو تو علم کو ذہنی اعتبار سے نہیں، بلکہ دینی و روحانی اعتبار سے۔ جن

تین حصّوں میں بانٹا جاتا ہے۔ وہ ہے علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔ یہاں سارے علوم کی بنیاد یقین پر رکھی گئی ہے اور یقین کا مفہوم ایمان سے تعلق رکھتا ہے۔

علم الیقین میں قدرت کی تخلیق پر یقین رکھنا ہوگا۔ کائنات کے نظم و ربط کا علم ہمارے معائنے و مشاہدے سے ماورا ہو بھی تو ہمیں اس کا اعتراف کرنا ہوگا۔ بن دیکھے بتائی ہوئی باتوں پر یقین رکھنا ہوگا۔ اگر استاد کہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے ورنہ یہ وجود میں نہ آتی تو ہمیں یقین کرنا ہوگا۔ استاد سے حجّت نہیں کی جاتی۔ کہ اگر خالق ہے تو پیش کرو۔ یہاں صرف عقل و شعور، ہوش و حواس اور ذہن سے کام لینا ہوگا۔ یہاں ادب، فلسفہ، تہذیب و تمدن، فقہ حدیث، تاریخ، قانون، معاشیات، سیاسیات وغیرہ علوم کا مسئلہ اُٹھے گا۔

عین الیقین میں مشاہدے، معائنے و مناظرے کی ضرورت ہے۔ جہاں دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے کی بدولت علم حاصل ہوتا ہے جو موجودہ زمانے کی موافقت سے سائنس و ٹکنالوجی کہلاتا ہے۔ مگر اس علم کا مقصد بھی کائنات کے ہر درخت کے پتی کو معرفت کردگار کا دفتر سمجھ کر خالق کی پہچان اور اس

کا اعتراف کرنا ہوگا۔

حق الیقین اِن دونوں شاخوں سے بھی اعلا و ارفع ہے۔ جہاں عرفان کی بدولت حق کی جستجو ہے، حقیقت کی تلاش ہے۔ فنا و بقا کے اسرار سے آگہی پاکر مالک حقیقی کی خوشنودی مقصود ہے۔ بہ الفاظ دیگر اسلامی علوم کی شناخت، شریعت، طریقت اور معرفت پر رکھی گئی ہے۔ شریعت میں حجت نہیں، معائنہ، مشاہدہ و مناظرہ نہیں۔ یہ دیکھنے، پرکھنے اور جانچنے کی چیز نہیں۔ صرف یقین کی چیز ہے۔ عین الیقین میں طریقت ہے۔ مشاہدہ و معائنہ و مناظرہ ہے۔ حقیقت کو سمجھنے، سوچنے اور پہچاننے کا طریقہ، سلیقہ، وسیلہ ہے۔ اس میں علم حیوانات، نباتات، جمادات، طبعیات، معدنیات، فلکیات، وغیرہ آتے ہیں، جہاں دل، دماغ، ہاتھ اور حس کے استعمال سے علوم کا پودا پروان چڑھتا ہے۔ یہ آج کل کی اصطلاح میں سائنس و تکنالوجی ہے۔ حق الیقین تصوف سے تعلق رکھتا ہے۔ جو معرفت کہلاتا ہے۔ یہاں حقیقت کے وہ مدارج طے کیے جاتے ہیں جو انسانی عقل و شعور سے بالا تر ہیں۔

اِس مضمون میں علم الیقین و حق الیقین سے بحث نہیں۔

صرف عین الیقین سے ہے جو سائنس و تکنالوجی کے زد میں آتا ہے۔
ہم یہاں سب سے پہلے اسلام میں سائنس کی ترویج کے اسباب پر ہلکی سی روشنی ڈالیں گے۔ اسلام میں سائنسی ترویج تین وجہ سے ہوئی۔ مذہب، تہذیب اور ریاست کے وجود سے۔ مذہب کے تین جزو ہیں جن سے علوم کو فروغ ملا۔ قرآن، حدیث اور فقہ۔ قرآن بار بار فکر کی، ذکر کی، تلاش کی، غور کی، علم کی، عمل کی، اور یقین کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن میں بے حساب ایسی آیات ہیں۔ جس میں کائنات کی تخلیق کی، جمالیات کی، حسن ونظر کی، نظم وربط کی افادیت کی تفصیلی تشریح کی گئی ہے۔ اِن پر غور کرنے سے کائنات کے حقائق واضح ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر صحیفۂ پاک کی ایک چھوٹی سی آیتِ کریمہ " وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَاءِ بُرُوجاً وَّزَیَّنّٰھَا لِلنّٰظِرِیْنَ " کو لیجیے۔ اس کے معنی " اور بے شک ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے پیدا کیے اور دیکھنے والوں کے لیے اس کو آراستہ کیا "۔ یہاں افلاک کا ذکر آیا۔ کائنات کا ذکر آیا۔ ستاروں کا ذکر آیا۔ تخلیق کا ذکر آیا۔ آراستہ وپیراستہ، نظم و نسق، ربط وضبط، خوب صورتی وجمالیات کا ذکر آیا۔ اور دعوت دی گئی کہ آنکھ اُٹھا کر آسمانوں کو دیکھو، قدرت کے کارخانوں

کو دیکھو، مالک کے کرشموں کو دیکھو، بے انتہا بروج کو دیکھو، اُن
لاکھوں کروڑوں درخشاں ستاروں کو دیکھو جن کے سامنے
ہمارے شمس وقمر حقیر چراغ ہیں اور ہمارا نظام شمسی ادنا تنکا
ہے۔ یعنی اِس آیت کا پہلا سبق فلکیات (Astronomy)
کی دعوت ہے، جہاں چاند، تارے، سورج اور بروج ایسے
آویزاں ہیں جیسے اندھیری رات میں چمکتے جگنو۔ اِن افلاک کی
کارکردگی۔ پر ہماری زندگی منحصر ہے۔ ان کی وجہ ہمارے موسم
بنتے ہیں۔ ہماری گرمی، سردی، بہار، خزاں کا پیام وہ لاتے ہیں۔
بارش وہ برساتے ہیں۔ خشکی، خنکی، برق، باراں، صبح وشام،
روشنی، تاریکی، سبھی اُن کے دم سے باقی ہے اور اِن سب
کا اثر ہماری زندگی پر پڑتا ہے۔

افلاک سے زمین پر آئیے۔ صحیفۂ پاک کے کئی آیۂ کریمہ
انسانوں وحیوانوں کی زندگی، اور نباتات، جمادات ومعدنیات
کے وجود سے متعلق ہے۔ ایک کا دوسرے سے کیا رشتہ
ہے، کیا انحصار ہے، کیا افادیت ہے، سبھی کچھ اختصار سے
نہیں، بلکہ تفصیل سے ذکر ہے اور ہمیں تلقین ہے کہ ان پر غور کیا
جائے۔ قرآن کی کئی سورتیں سائنس کے عنوان سے شروع

ہوتی ہیں، مثلاً بقر، انعام، (جانور) عنکبوت، (مکڑی)، نحل (مکھی)، نمل (چیونٹی)، رعد (بجلی)، الحجر (پتھر)، شمس، قمر، نور، لیل، فجر، دہر، زخرف (سونا) مرد، عورت وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کے بعد رسول اکرمؐ کے ارشادات واحادیث کا طفیل ہے کہ ہمارے علما، علم کے بام عروج پر پہنچ گئے تھے۔ رسول اکرمؐ سے بڑھ کر شاید ہی کوئی نبی ایسا گزرا ہو جس سے تحصیل علم اس قدر شدت سے اصرار کیا ہو۔ آپ کا ارشاد ہے کہ ایک گھنٹہ کا تفکر ستّر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ ایک عالم کے ساتھ ایک گھنٹہ کی صحبت بہتر ہے ایک ہزار راتوں کی نماز سے۔ عالم کی روشنائی افضل ہے شہیدوں کے خون سے تعلیم کا حاصل کرنا تقوہ ہے، اس کا تذکرہ اللہ کی عبادت ہے، اُس کی تحصیل اللہ کی خوشنودی ہے۔ وہ جنت کی کنجی ہے، راحت کا سامان ہے، حقیقت کا راز ہے، زندگی ساز ہے۔ انسان کا جوہر ہے، تمدن کی آبرو ہے، حیات کا سرچشمہ ہے، دنیا کی جڑ ہے، دین کی روح ہے، جنگ کا ہتھیار ہے، امن کا ساتھی ہے، غم کا سہارا ہے، مسرت کا وسیلہ ہے، اور اللہ کا نور ہے۔ یہ وہ دولت ہے جس کو پا کر انسان

اشرف المخلوقات کا درجہ پاتا ہے اور اس کو کھو کر تو مذلت میں گر پڑتا ہے۔

ان تعلیمات کا وہ اثر ہوا کہ ابن جوزی دو سو کتابوں کے مصنف بن گئے۔ مغیرہ کا کہنا ہے کہ وہ بادشاہوں سے زیادہ استادوں سے کانپ جاتے تھے۔ مورخ ابن جابر مسلسل چالیس سال تک روزانہ لگ بھگ اٹھائیس صفحوں کے حساب سے لکھتے رہے۔ محدث حیرہ جو عراق کے تھے۔ جب گرمیوں میں لکھتے تھے تھک جاتے تھے تو ٹب میں بیٹھ کر لکھتے تھے۔ المدائنی کی تصانیف کی فہرست پانچ صفحوں سے زیادہ تھی۔ الواقدی جہاں بھی جاتے اپنے ساتھ اپنی کتابوں کا انبار ۱۲۰ اونٹوں پر لدا ہوا ساتھ لے جاتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اُس زمانے کا کوئی ایسا علم نہ تھا جس پر مسلمان حاوی نہ ہوئے ہوں۔ فلسفہ، طب، ہندسہ، ادب، نجوم، تاریخ، جغرافیہ، عروض، کیمیا، سیاست، فقہ، غرض ہر شعبے میں یکتا نکلے۔ مدینہ، دمشق، بغداد، نیشاپور، قاہرہ، قرطبہ، شیراز، طوس، تبریز اور دیگر مقامات علم کا مخزن بن گئے۔

سائنسی علوم میں اُن شاخوں کو ترجیح دی گئی جس سے

انسانوں کو زیادہ فائدہ مقصود تھا۔ مثلاً طب، کیمیا، ریاضی، طبیعیات، معدنیات، فلکیات، نبادات وغیرہ۔ ابوبکر محمد ذکریا رازی علم طب کے درخشاں ستارے تھے۔ ان کی کتاب حاوی صدیوں تک، یوروپی طبی درسگاہوں کی لازمی درسی کتاب رہی۔ جب بغداد کا شفاخانہ "بیمارستان" کے جائے وقوع کا مسئلہ اٹھا تو آپ نے تجویز پیش کی کہ شہر کے مختلف حصوں میں گوشت لٹکا دیا جائے اور اُس جگہ کا انتخاب کیا جائے جہاں اُس کا سڑنا کم سے کم ہو۔ آپ کی عظمت کا یہ اعتراف تھا کہ آپ کی اور ابوعلی سینا کی تصویر کو پیرس کے مشہور دارالعلوم کے ایوان کی زیب و زینت بنایا گیا۔ ابوعلی سینا کی کتاب کو بھی یوروپ کے دانش گاہوں میں وہ اعزاز حاصل رہا کہ ڈاکٹر ولیم ازلر رقمطراز ہے کہ:۔

"کسی اور کی تصنیف اس قدر لمبی مدت تک
طبی انجیل نہ مانی گئی"

قاہرہ کے احمد بن طولون کا ہسپتال ایسا تھا کہ اس کا مقابلہ یوروپ کے موجودہ ہسپتالوں سے کیا جا سکتا ہے۔ تبریز کے رشید الدین فضل اللہ کے مطب سے ساری اسلامی دنیا کو دوائیں بھیجی جاتی تھیں۔ حکیم فضل اللہ نے جو وزیر بھی تھے ہندستان

مصر، شام اور دیگر مقامات سے پچاس ایسے ماہر طبیبوں کو اکٹھا کیا جو اپنے فن کے استاد سمجھے گئے تھے اور ہر ماہر کے ساتھ چنندہ دس ہونہار شاگردوں لگا دیا کہ وہ تربیت پائیں۔ طبیبوں کو روزانہ جیل خانہ جا کر معائنہ کرنا پڑتا تھا کہ آیا وہاں حفظان صحت کا خیال رکھا گیا ہے یا نہیں۔ ہر سال طبی درسگاہوں سے امتحانوں میں جو کامیاب ہوتے تھے۔ انھیں کو اجازت تھی کہ معالج کا پیشہ اختیار کریں۔ چنانچہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ۹۳۱ عیسوی میں بغداد میں ۸۶۰ طلبا رطب میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح بغداد غبی حکیموں سے پاک رہا۔

مسلمانوں کا کارنامہ علم طبیعات اور خاص کر علم کیمیا میں حیرت انگیز رہا۔ جابر بن حیان اِس میدان کے سردار تھے۔ جنھوں نے کئی کیمیائی عناصر کی تلاش کی جن میں بائیس مرکب ہم تک پہنچے ہیں۔ عربوں کو خبط تھا کہ کیمیائی ترکیب سے نچلے دھات جیسے لوہا، تانبا، زریں دھات جیسے سونا چاندی بن سکتے ہیں اِس کے حصول کے لیے اُنھوں نے بڑی بڑی کوششیں کیں۔ ازحد سر کھپایا، مدتوں اُس کی تفتیش میں لگے رہے اور اتنے تجربے کیے کہ جن سے کئی عناصر و مرکب کا پتہ چل گیا۔ فلکیات

اور عروض کے نامور جید عالم الفوارزمی، القاسمی، الخارجی، فارابی، نصیر الدین طوسی، عمر خیام وغیرہ ہیں۔ علم عروض کو تعمیرات اور فلکیات کے لیے کام میں لایا گیا۔ بنو موسیٰ نے بڑے بڑے جہازوں کی صنعت کا اجرا کیا۔ البیرونی نے چیزوں کی (Specific Gravity) ڈھونڈی۔ ابن الحطام نے دریائے نیل سے آبپاشی کے طریقے تراشے۔ الجارزی نے کئی ایجادات کیں جن میں گھڑی، پانی کو گہرائی سے اٹھانے کی ترکیب، فوارے، جہاز سازی، زمین کو ناپنے کا آلہ وغیرہ شامل ہیں۔

مامون الرشید نے بغداد اور دمشق میں فلکیاتی تجربہ گاہیں قایم کیں۔ اس کے سائنس داں زمین کی پیمائش میں کامیاب رہے۔ الحاسب نے چاند اور سورج گرہن پر تحقیق کی۔ نصیر الدین طوسی مسلسل بیس برس فلکیات میں لگے رہے۔ سمرقند کی فلکیاتی تجربہ گاہ آج بھی موجود ہے۔ ابن شاطر کے تحقیقات کا مقابلہ کوپرنیکس سے کیا جاتا ہے۔ القندی ابن اسحٰق، ابوعلی سینا اور ابن حطام کی تحقیقات چشم سازی (Optics) میں سبقت لے گئے۔ ایران کے ایک سائنس دان کمال الدین نے سورج کے شعاعوں پر کام کیا اور

قوس قزح کا راز ڈھونڈ نکالا۔

عرب سیر و سیاحت میں مشہور تھے۔ اس لیے وہ جغرافیہ کے باوا آدم مانے گئے۔ حج بیت اللہ کا فرض، تجارت کا پیشہ، سفر سے رغبت، تبلیغ سے الفت، اور اسلامی مملکت کی وسعت اور علم کی تلاش کی وجہ سے وہ ہمیشہ خانہ بدوش ہی رہتے۔ وہ ہر شہر میں پہنچ جاتے، وہاں کے حالات قلمبند کرتے، اور ان کے تجربے الف لیلہ کی کہانیاں کا موضوع بنتے جاتے تھے۔ الخوارزمی نے اسلامی ممالک کا پہلا نقشہ تیار کیا۔ کرۂ ارض کی طول و عرض معین کی۔ زمین کا مرکز ڈھونڈا۔ ترکی امیر البحر پیری رئیس نے بحر قلزم کے ہر حصّہ کو چھان مارا۔ احمد بن ماجد نہ ہوتا تو کولمبس ہندوستان نہ آسکتا تھا۔

غرض سائنس کے میدان میں مسلمان قرون وسطٰی کے درخشاں ستارے نکلے۔ لیکن اُن کے علوم کا زاویہ نگاہ نرالا تھا۔ ان کے پاس موجودہ ذہنی اجارہ داری (Intellectual Property) مفقود تھی۔ اُن کے نزدیک ایجاد و اختراع ہر ایک کا حق تھا۔ وہ اُن کی ذہنی کاوشوں کا سودا نہیں کرتے تھے۔ وہ علوم کو انسانیت کا مال تصور کرتے تھے۔ ان کے علوم و ایجادات میں

اخلاق پہلو اولین بنا اور تجارتی پہلو نایاب تھا۔ ساری مخلوق کو خالق کا کنبہ تصوّر کرنے کا جذبہ ان کے دل میں موجزن تھا۔ ان کا دل خالق کے لیے وقف تھا، اُن کا دماغ علوم میں مصروف تھا اور ان کا تن من دھن خلقت کی خدمت کے لیے مخصوص تھا۔ انسانیت کا پیغام، اخلاق کی درستگی، عوام کی فلاح و بہبود کا، ریاست میں امن و امان اور مملکت میں حق و انصاف، ان کے علوم کا مقصد تھا۔ حق کی تلاش، جمالیات کی جستجو، محبت و ہمدردی، ان کے عین الیقین، یعنے سائنس کا مدعا تھا۔

اخوان المسلمین ۔ ایک مصری اسلامی تحریک

تاریخ تہذیب انسانی کا وہ آئینہ ہے جس میں قوموں کا عروج وزوال، کمالات وخیالات، حوادثات وواقعات اور افراد کے کارنامے، منصوبے، مرحلے، حوصلے، عقل وشعور تفکر وتدبر وغیرہ وغیرہ کی داستان جھلکتی ہے۔ ماضی کا یہ آئینہ اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ناپے، جانے، سمجھے اور پرکھے اور پھر ایسا قدم اٹھائے جس سے تخلیق کا مدعا یعنی نائب حق کہلانے کا مستحق بن سکے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ملت اسلامیہ کا ایک دور ایسا شاندار بھی تھا کہ وہ سارے عالم پر چھائے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اور ایک ایسا دور بھی آیا جب کہ اُن کی پستی حد درجہ درد انگیز رہی۔ پستی کا یہ دَور اُن کے سیاسی اقتدار کے زوال

سے شروع ہوتا ہے جب کہ مغرب میں دولت عثمانیہ اور مشرق
میں مغلیہ شہنشاہیت دم واپسیں پر تھیں۔ انحطاط کے آثار
جب نمودار ہوئے تو ارباب علم و دانش خاموش نہ رہے بلکہ
اپنی بساط کے مطابق ملت کی شان برقرار رکھنے میں ہمہ تن
مصروف رہے۔ یہ باب اٹھارویں صدی عیسوی سے
شروع ہوتا ہے اور اس کا سلسلہ بفضل تعالیٰ اب تک
برابر جاری ہے۔ کئی ایک اصلاحی، تعلیمی، تنظیمی، سیاسی،
نظریاتی تحریکیں ظہور میں آئیں اور صفحۂ ہستی پر اپنا نقش قدم
چھوڑ گئیں۔ کبھی نجد سے محمد بن عبدالوہاب کی پکار اٹھی کہ
اسلامی عقیدوں میں اصلاح ضروری ہے۔ کبھی لیبیا کے ریگ
زاروں سے صدا بلند ہوئی کہ سامراجی طاقتوں کے خلاف
متحد و منظم ہو جاؤ۔ کبھی ہند کے مسلمانوں کو سرسید نے
جھنجھوڑا کہ وہ خواب غفلت سے جاگیں اور جدید روشنی
میں اپنے آپ کو حالات حاضرہ سے نپٹنے کے لیے تیار ہو جائیں
کبھی افغانستان سے سید جمال الدین افغانی نے للکارا کہ اگر
دین کی رسّی مضبوطی سے تھام لوگے تو تمھاری بہتری ہے۔
کہیں مفتی محمد عبدہٗ، کہیں سید رشید رضا، کہیں عبدالقادر مغربی

کہیں سید احمد شہید، کہیں شبلی نعمانی، کہیں عبید اللہ سندھی، اور کہیں مولانا محمد علی جوہر نے ملت کی ڈوبتی کشتی کو طوفان کے تھپیڑوں سے بچانے میں اپنی زندگی وقف کردی۔ اِنھیں بزرگوں کے اسمائے گرامی میں شیخ حسن البنا کا نام نامی بھی آتا ہے جنھوں نے مصر میں اخوان المسلمین کے نام سے ایک تحریک چلائی جس کا خاص مقصد ملت اسلامیہ کی معاشرتی، ثقافتی، سیاسی و تعلیمی حالت بہتر سے بہتر بنانا ہے۔

حسن البنا نے اپنی تحریک ۱۹۲۸ء میں شروع کی بیسویں صدی کی یہ سب سے بڑی اور پہلی منظم اسلامی تحریک تھی۔ شیخ، علوم اسلامیہ ہی سے نہیں بلکہ علوم جدید سے بھی بہرہ ور تھے۔ اُن کا اور اُن سے پہلے گزرے ہوئے سبھی مصلحوں کا یہی مسلک رہا کہ ملت اپنے کھوئے ہوئے وقار کو پھر سے حاصل کرلے۔ شیخ نے سارے عالم عرب میں ایک ذہنی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ اِس تحریک کی بنیاد کافی مضبوط تھی۔ اِس کے چند نظریاتی اصول یہ تھے۔ پہلا "اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کیسے دین کو کھوئے بغیر جدید مادّی ترقی کو قبول کیا جائے اور اِس سے کیسے صحیح فائدہ

حاصل کیا جائے۔ دوسرا، دین کے مفہوم یعنی روح اسلامی سے کیسے مطابقت پیدا کی جائے تاکہ اسلامی تعلیمات کے فوائد بھی جدید معاشرے میں کھپ سکیں۔ دوسرے الفاظ میں مغرب کے ابھرتے ہوئے سیلاب سے کیسے اسلامی معاشرے کو بچائے رکھیں۔ تیسرا، آزادئ فکر اور اجتہاد کی راہ ہموار کی جائے۔ اسلامی علوم کے جمود کو توڑا جائے اور اِن میں پھر وسعت و جامعیت بھر دی جائے۔ اِس کام کے لیے شیخ نے ایک لائحۂ عمل تیار کیا، وہ یہ تھا۔ فکر کو بیدار اور دعوت کو عام کر دیا جائے۔ اِس کے لیے جو ضروری تیاری درکار ہو وہ فوری طور پر عمل میں لائی جائے۔ یعنی رفقا کی ایک جماعت جو دل و جان سے تنظیمی کام میں لگ جائے۔ اہم مسئلہ عمل کا تھا، عمل اور صحیح طریقہ کا عمل۔ شیخ رفقائے کار کی تربیت میں منہمک ہو گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ رفقا کی کثرت نہ ہو۔ جنگ فوج کی تعداد سے جیتی نہیں جاتی، اُس کی تنظیم سے، شجاعت سے، قیادت سے اور اسلحہ کی فوقیت سے جیتی جاتی ہے۔ شیخ مفکرانہ نظر رکھتے تھے اور اُنھیں یہ علم کہ صحیح تنظیم وہ ہے جس میں سارے حالات کا بہ خوبی اندازہ ہو، صحیح

فیصلوں کا شعور ہو، ان فیصلوں پر عمل پذیرائی کی سکت ہو، فیصلوں میں نئے خیالات جذب کرنے کی لچک ہو اور سب سے زیادہ کام کرنے والوں میں صبر و استقلال و یقین کامل ہو، اپنے نصب العین کا انھیں پورا پورا علم ہو۔ اخوان کوئی جدید پیغام لے کر نہیں اٹھا تھا بلکہ ایک قدیم چیز کو زندہ کر رہا تھا، بھولا ہوا سبق یاد دلا رہا تھا۔ اسلام زمان و مکان کے دائرے میں محدود نہ تھا، آدم کے وجود سے ہی اِس کی ابتدا ہوئی تھی۔ ہر ہادی و رسول کا پیغام وحدت ہی تھا۔ خالق کی وحدت اور خلقت کی وحدت کو عام کرنا ہی اسلام کا مدعا تھا۔ نظریۂ قومیت، سرمایہ داری، سامراجی غلبہ، ذات پات کی تفریق، نسل، رنگ روپ کی فوقیت وغیرہ کی وجہ سے فرزندِ آدم احکام خداوندی کو بھول بیٹھا تھا۔ اخوان اِن کمزوریوں کو دور کر کے ایک صالح نظامِ زندگی کے نفاذ کا ارادہ رکھتا تھا اور خاص کر اُن ممالک میں جہاں اسلام کی جڑیں مضبوط تھیں۔

اپنے منصوبوں میں کامیابی کے لیے نظریاتی سطح پر اخوان نے چند اصول تراشے، پہلا تحصیل علم پر فوری و گہری توجہ، جہالت ذلت کا سرچشمہ ہے۔ اُس کی بیخ کنی کی جائے۔ علوم، صحیح علوم،

دینی علوم، اخوان کا مرکزِ محسوس رہا۔ قرآن کریم علم کا مرجع ہے۔ اس کی تشریح ایسی ہو کہ سارے شکوک رفع ہو جائیں۔ ایمان، اسلام، احسان سے ہٹ کر مسلمان سرخرو نہیں ہو سکتا۔ خدا بینی، خود بینی و جہاں بینی کے بغیر وہ سنبھل نہیں سکتا، توحید، تبلیغ و تعلیم کو چھوڑ کر وہ بامراد ہو نہیں سکتا۔ خدمتِ خلق، عشق رسول و نیابت الٰہی کا جذبہ نہ ہو تو فوق البشر نہیں بن سکتا۔ یعنی وہ اچھی طرح قرآن کریم کی ان ہدایات کو سمجھ جائے کہ حیات وہ ہے جہاں حقائق عالیہ پر نظر ہو، جہاں تعین عمل و ذوق ہو، جہاں جلب منفعت (امر معروف) ودفع مضرت (نہی منکر) کا احساس ہو اور جہاں نفس، ضبط و طاعت و تفکر سے تدریجی نشوونما انسان پاتا ہو۔ بالفاظ دیگر قرآن کریم سے صرف عقلِ برہانی ہی نہیں بلکہ عقلِ نورانی و روحانی بھی حاصل ہوتی ہے۔ عقل برہانی سے بشر احتساب کائنات کا اندازہ لگاتا ہے اور عقل نورانی سے ان حقائق عالیہ کا جس سے جُز مرتبۂ کُل پالیتا ہے، قطرۂ شبنم گوہر نایاب بن جاتا ہے، شرر شعلہ میں ضم ہو کر نور کا حصّہ بن جاتا ہے۔

تحصیل علم کے بعد اخوان کی نظر عمل پر تھی۔ تمام مسلمانوں کو ایک قرآنی امت بنانے کی جدوجہد انھوں نے شروع کر دی

تمام اسلامی فرقوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا طریقہ سوچا اور اس پر عمل کا آغاز بھی کیا۔ عمل خواب کی تعبیر ہے۔ قدرت ہمیشہ کاوش میں ہے۔ کائنات میں ہر لحظہ کچھ نہ کچھ تخلیق ہے۔ کہیں پھول کھل رہے ہیں، کہیں سبزہ اُگ رہا ہے، کہیں تارے چمک رہے ہیں، کہیں موج تڑپ رہی ہے، ہر شئے اپنی فطرت کا تقاضی پوری طرح ادا کر رہی ہے۔ ندرت فکر عمل سے معجزات زندگی۔ ندرت فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب" مگر اسلام نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ عمل نیک ہو۔ صالح عمل کی ترغیب ہے اور بُرے عمل سے انحراف۔

اخوان کا تیسرا مرحلہ معاشی حالت کی سدھار تھا۔ روٹی، روزی، کپڑا، مکان کے بغیر آدمی حراساں و پریشان رہتا ہے۔ لاعلمی کے بعد غربت سب سے بڑی نحوست ہے۔ زیست کے لیے اہم ضروریات تو میسر ہوں۔ اخوان کی کوشش رہی کہ مصری نوجوان کو صحیح کسب معاش کے ذرایع بھی بتائیں اور اُن کے لیے کسی فن یا ہنر کی تربیت کا سامان بھی فراہم کیا جائے۔ چوتھا اصول ایک ایسے معاشرے کی داغ بیل ڈالنا تھا جہاں عدل و انصاف ہو، اجتماعی بھلائی و بہبودی کا خیال ہو، انسانی حقوق و آزادی کے

امکانات مستحکم ہوں۔ سامراجی طاقتوں نے ملت کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ ساحرانِ مغرب نے اپنے مفاد کے لیے امت مسلمہ کے حقوق کچل دیئے تھے۔ اخوان نے اِن کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ غرض اخوان کا اصل مقصد انسانی تہذیب کی اسلامی روایات کے پس منظر میں ازسرنو تشکیل، مادہ اور روح، دونوں سے استفادہ، فروعات سے گریز، فقہی اختلافات سے دوری، نوجوانوں میں اسلامی جذبہ کا اُبھار، امیروں سے اور مغربی طرز کے حامیوں سے علاحدگی، عوام سے زیادہ لگاؤ ورغبت، اتحادواتفاق پر زیادہ زور اور ایک ایسا انقلاب جو عقیدہ، عمل اور وحدت پر کھڑا ہو۔

اخوان کے مقاصد اعلاوارفع تھے۔ اسلام کو مخصوص زمانے کی رسوم وقیود سے آزاد کر کے بنی نوع انسان کے لیے عام کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے مدنظر وہ اسلام تھا جو صحابۂ کرام کے زمانے میں تھا، وہ اسلام جو حضرت عمرؓ نے پھیلایا تھا۔ وہ اسلام جو عقیدہ، عبادت، وطن، ریاست، سیاست، معیشت، سب پر حاوی ہو کر انسانیت کا پرچم بلند کرتا تھا۔ اگر اسلام میں قانونِ سیاست، قانونِ معاشرت وقانونِ

ثقافت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ صرف چند رکعت نماز کا نام اسلام نہیں ہے۔ اگر اشتراکیت یا سوشیلزم جس کی بنیاد صرف اسلام کے ایک پہلو، مساوات، پر ہے، حکومت و اقتدار کی دعوت دی جاتی ہے تو کیوں نہ اسلام کے نام پر جو ایک مکمل نظام حیات ہے اور جس میں اخوت و مساوات کے علاوہ حقانیت، روحانیت اور انسانیت کا پیغام بھی موجود ہے، لوگوں کو بلایا جائے؟ اگر اسلام ایک دستور حیات ہے۔ تو اس کے بغیر جینا عبث ہے۔ اِس کے لیے اخوان نے مناسب سمجھا کہ اجتہاد کا دروازہ کھول دیا جائے۔ اسلامی قوانین کی پھر سے جانچ پڑتال کی جائے، انھیں اِس انداز سے مرتب کیا جائے کہ وہ زمانہ کا ساتھ دیں۔ اخوان کی دعوت سید جمال الدین افغانی و محمد عبدہٗ کی دعوت سے بہت مطابقت رکھتی ہے۔

اخوان کی تحریک سے ایک صالح لٹریچر پیدا ہوا، ذہنوں میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ نوجوانوں میں اسلامی شعور ابھرا۔ باہمی تعاون و اشتراک کا جذبہ نمودار ہوا۔ مغربی تعلیم سے اسلامی روایات کے خلاف جو شک و شبہ پھیل رہا تھا، اُس کا کچھ تو ازالہ ہوتا نظر آیا۔ یہ تحریک عوام سے قریب تر تھی۔ اِس

کے اکثر ارکان مزدور پیشہ اور غریب طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اخوان نے مساجد، مدارس، اور رفاہِ عام کے مرکزوں کا ایک جال سارے مصر میں بچھا دیا۔ جدید تعلیم یافتہ بھی اس کے دلدادہ بن گئے۔ چند اصلاحی امور پر بھی توجہ مبذول ہوئی۔ شراب نوشی کا انسداد، سرکاری دعوتوں میں اُس کی اجازت پر تنقید، جوئے کی گرم بازاری پر روک تھام، نائٹ کلبوں کے خلاف احتجاج، ریس کورس پر پابندی، عورتوں کی ہیجان خیز تصویروں کی اشاعت پر تنقید، گھروں میں انگریزی و فرنچ بول چال کے بجائے عربی بول چال کی تشہیر، کالجوں و درسگاہوں میں یوروپی سٹاف کی بجائے مصری استادوں کا تقرر، مخلوط تعلیم پر نکتہ چینی وغیرہ وغیرہ ایسے اصلاحی امور تھے جن پر خاص توجہ کی وجہ سے چند دن میں ہی اخوان مقبول و مشہور ہوئی۔

دوسری جنگ عظیم کا زمانہ اخوان کے عروج کا دور تھا۔ گویا اس نے ایک متوازی حکومت قائم کر دی تھی۔ ہر شہر اور گاؤں میں اخوان کے مراکز، تعلیمی ادارے، سماجی ادارے، مساجد، اخوانیوں کے اخبارات، رسالے، پمفلٹ اور ٹھوس کام کی وجہ صرف مصر ہی نہیں بلکہ ہمسایہ ملکوں، جیسے شام، لبنان،

اردن، فلسطین، ٹیونس، مراکش و سوڈان میں بھی اس کی کئی شاخیں کھل گیئں، عرب اسرائیل کی جنگ میں اس قدر بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا کہ کہا جانے لگا کہ اسرائیل کو عرب فوج سے خطرہ نہ تھا۔ سب سے زیادہ اخوان سے ہی ڈر تھا۔

افسوس کہ یہ عروج قایم نہ رہا۔ اخوان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے ارباب حکومت میں نخوت کی آگ بھڑکا دی۔ دیکھا گیا ہے کہ سامری فضا طاعون کی طرح پھیلتی ہے۔ گلچین کے ہاتھ پھولوں کو نکھرنے نہیں دیتے۔ مرغزاروں میں آہو کی اُڑان شکاری کی ہوس بھڑکا دیتی ہے۔ حق و باطل کی جنگ میں اکثر باطل کا پلڑا ہی بھاری نظر آتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں حکومت نے اخوان کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا۔ ہزاروں اخوانیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں شیخ حسن البنا بیدردی، سے شہید کر دیے گئے۔ حتیٰ کہ سید قطب جیسے جید عالم کو بھی پھانسی دے دی گئی۔ یہ سب اس لیے کہ اخوان کے ہوتے صاحب اقتدار اپنی من مانی نہ کر سکتے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں جمال عبدالناصر نے اخوان پر بڑا ظلم توڑا۔ انھیں انتہائی بیدردی، سفاکی و وحشیانہ طور پر ختم کرنے کی کوشش کی۔ انور سادات کے زمانے میں اخوان

پھر اُبھری ۔ مگر وہ بات نہ رہی جو حسن البنا کی قیادت میں تھی ۔
آخر میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اخوان سے ہم کیا سبق سیکھ سکتے ہیں ۔ اول یہ کہ اصلاحی کاموں کے لیے ایک طویل عرصہ تک فضا تیار کرنی ضروری ہے ۔ ہر قدم پھونک پھونک کر اُٹھانا پڑتا ہے ۔ بڑے صبر واستحکام کی ضرورت پڑتی ہے ۔
"منادی نہیں حق کی کچھ دل لگی ــــ بہت یاں ہیں درکار قربانیاں"
دوم یہ کہ غیروں سے زیادہ اپنوں سے محتاط رہنا چاہیئے ۔ خود غرضی میں خونی رشتہ بھی نہیں دیکھا جاتا ۔ اپنے مفاد کے لیے لوگ قوم و ملت کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں ۔ اخوان کا خاتمہ ناصر کے ہاتھوں ہی ہوا جس کا دعوا بھی ملت کی جماعت ہی کا تھا ۔ سوم یہ کہ زندگی کا سفر لامتناہی ہے ۔ صبر واستقلال کا امتحان ہے ، ہمت وحوصلہ کی آزمائش ہے ۔ شجاعت و بہادری کی دعوت ہے ۔ زندگی کی کوئی منزل نہیں ۔ یہ وہ ڈرامہ نہیں جس کے آخری سین پر دہ گرا دیا جاتا ہے ۔ بلکہ ازل سے ابد تک تغیر وتبدل کا ایک سیلاب ہے جس میں تنکے کی طرح افراد ابھرتے ہیں اور اپنی ایک جھلک دکھا کر خس و خاشاک کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں ۔ اس سیلاب میں حسن البنا

کا چہرہ جو ہمیں نظر آیا، وہ مہر تابان کی طرح درخشاں تھا اور اس کے مد مقابل ان کے حریف بھیانک قسم کے کردار نظر آئے۔ عظمت کا سہرا کامیاب لوگوں کے سر ہی باندھا نہیں جاتا بلکہ ان لوگوں کے سر بھی جو بہ ظاہر ناکام نظر آتے ہیں۔ مثلاً سقراط، سلطان شہید سید تا حضرت امام حسینؓ یا سرخیل مجاہدین حضرت ٹیپو سلطان شہید ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
ایک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اقوام متحدہ کا تاریخی پس منظر و تنقیدی جائزہ

عالمی سطح پر خونریزی و چنگیری سے بچنے کے لیے ذہن انسانی نے جو بھی تدابیر سوچیں۔ اُن میں سب سے اہم تدبیر مجلس اقوام متحدہ ہے۔ اس سلسلہ میں فرزند آدم کئی تجربے کر چکا تھا، اور ہر مرتبہ زک اٹھا چکا تھا۔ انبیاء، اولیاء، اصفیا کا پیغام بھی امن وامان، صلح و آشتی ہی تھا اور مدبروں و دانشوروں کا بھی۔ عقل و دل و نگاہ کا فیصلہ بھی تھا کہ روح انسانی داغ داغ نہ ہو پائے، لیکن خیر و شر کے اِس سخت آزمائش میں شر کی ہی فتح ہوتی رہی۔ ہمیشہ زبردست ہی خون چوستے رہے۔ ظالم کا ہی ڈنکا بجتا رہا۔ فاتح کی شان ہی بڑھائی جاتی تھی، اور سکندر و قیصر و کسریٰ کے قصیدے ہی گائے جاتے تھے۔ قیامت تھی کہ انسان نوع انسان

کا شکاری بن چکا تھا۔ یہ سلسلہ ازل سے برابر چلا آرہا ہے۔
تاریخ انسانی میں سب سے پہلے منظم طریقہ پر جنگ کی بیخ کنی کا خیال ہندوستان کے مشہور شہنشاہ اشوک کے ذہن میں پیدا ہوا۔ عین فتح ونصرت کا نقارہ بجاتے ہوئے اس نے حلف اٹھایا تھا کہ وہ کبھی پھر اپنی تیغ کو بے نیام نہیں کرے گا، اور اِس حلف پر وہ تازیست قایم رہا۔ اُس کا نتیجہ یہی نکلا کہ اُس کے بعد موریہ خاندان ہی ختم ہوگیا۔ اس کے بعد دو ہزار سال بیت گئے۔ خون کی ندیاں بہتی رہیں۔ یوروپ میں انقلاب فرانس برپا ہوا، اور وحشت و دہشت اپنی انتہا پر پہنچ گئی۔ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے نپولین میدانِ کارزار میں کود پڑا۔ اِس شہر کو انسانی خون اس قدر پسند آیا کہ ساٹھ جنگوں میں فتح ونصرت کے جھنڈے بلند کرتے ہوئے سارے یوروپ میں قیامت صغریٰ برپا کردی۔ لیکن ہر فرعون کے حق میں ایک موسیٰ تجویز ہے۔ اکسٹھویں جنگ واٹرلو میں لڑی اور وہاں شکست کھاکر سینٹ ہلینا کے جزیرے میں بہ حیثیت قیدی آخری سانس لیا۔

نپولین اس لیے اہم ہے کہ وہ پہلا سپہ سالار ہے جس کی تیغ بے نیام سے یوروپی مدبروں کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ جنگوں کا سلسلہ ختم کیا جائے؟ نہ رہے بانس نہ بجے بنسری۔ موجودہ زمانے میں جنگوں کی بیخ کنی کا مضبوط خیال یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ روس کا بادشاہ الگزینڈر اول نے یہ تجویز پیش کی کہ عیسائی مذہب کے نام پر ایک "مقدس وفاق" (Holy Alliance) تشکیل دیا جائے جس میں یوروپ کے سبھی عیسائی ممالک شریک ہوکر اس بات کا عہد کریں گے کہ وہ آپسی معاملات گفت وشنید سے طے کریں گے اور جنگ و جدال کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیں گے۔ ظاہر ہے کہ مذہب کے نام پر یہ پکار بے وقت کی راگنی تھی۔ یوروپ کبھی کا مذہب کو سیاست سے الگ کر چکا تھا یوروپی مفکروں کے نزدیک یہ تجویز شہد میں زہر گھولنے کے برابر تھی۔ اس کو رد کر دیا گیا۔

لیکن نپولین کے کرتوت کیسے بھلائے جا سکتے تھے۔ جب کہ اٹھارہ سال تک (۱۷۹۷ تا ۱۸۱۵) یوروپ کی ہر ماں اپنے لال کی قربانی دے چکی تھی؟ ساحرانِ مغرب نے

اپنے کرتب کا ایک کرشمہ دکھانا چاہا اور "یوروپی اشتراک" (CONCERT OF EUROPE) وجود میں آئی۔ جس میں موجودہ اقوام متحدہ کا ایک ہلکا سا شائبہ ہمیں نظر آتا ہے، لیکن اس کی کمزوری بھی وہی رہی جو آج بھی ہے، یعنی "زبردست خاں کے ڈُو حقے" اور اسی وجہ سے حق و انصاف کے پھول نہیں کھلتے۔

۱۸۲۸ء میں دوسرا انقلاب آیا۔ ایک اور نپولین نمودار ہوا۔ اس کو ختم کرنے کے لیے ایک اور "مردِ آہن" بسمارک کی شکل میں اٹھا۔ بسمارک نے جرمن قوم کو نیا سبق پڑھایا کہ زندگی کا راز، طاقت میں مضمر ہے، کمزوری سب سے مہلک امراض کی جڑ ہے۔ فتح ونصرت کا دوسرا نام نیکی ہے، اور شکست وہار کا دوسرا نام بدی ہے۔ اس فلسفۂ حیات سے جرمن قوم آسمانِ عروج پر ابھر آئی۔ نتیجہ قیصر دوم کے زمانے میں پہلی جنگِ عظیم!

پچھلی ساری جنگیں اس جنگ کے مقابلے میں بازیچۂ اطفال تھیں۔ ملک گیری کی ہوس، اقتدار کا نشہ، دولت کی فراوانی، اسلحہ کا انبار، وآپسی رسہ کشی اس حد کو پہنچ گئی کہ یوروپ کا کوئی چپہ خون کے دھبوں سے بچ نہ سکا۔ نسلِ انسانی کے لیے

یہ ایک سخت آزمائش کا وقت تھا۔ جب کہ آدمی وقت سے پہلے ہی قیامت برپا کر چکا تھا۔

جنگ کے خاتمہ پر ارباب حکومت کے سروں سے اقتدار کا کچھ نشہ اُترنے جو لگا تو ضمیر کی پکار پر "اقوامی لیگ" ظہور میں آئی۔ ارادے تو بہت نیک تھے اور حوصلے بلند۔ جینوا۔ اِس کی قرارگاہ طے پائی۔ فرزند آدم پھر جنگ و جدل سے مائل توبہ تھا۔ اس کے لیے راضی تھا کہ تمام جھمیلے، جھگڑے، فسادات، اختلافات، ناچاقیاں، ناانصافیاں، حق تلفیاں و بدگمانیاں، بھائی چارے سے مل بیٹھ کر طے ہو جائیں گی۔ تجویز تو مبارک تھی۔ مگر تعمیل ایسی مشکل جیسے شیر کو شکار سے منع کرنا، بلّی کو دودھ سے باز رکھنا، یا بھیڑیے کو بکری سے دوستی کی دعوت دینا۔ نتیجہ دوسری جنگ عظیم!

اب جو ہٹلر آفاقی افق پر آئے تو کائنات دہل گئی۔ پہلی جنگ عظیم دوسری جنگ عظیم کے سامنے ایسی حقیر تھی جیسے سورج کے سامنے شمع۔ درندے پھر ناچ میں مست تھے۔ چھ سال تک یہ ڈرامہ چلا جب کہ ہر لحظہ، ہر دم، ہر آن، اشرف المخلوقات، انسان، قدرت کی خلقت کو یوں مٹاتا

رہا جیسے حشرات الارض ہاتھیوں کے غول میں کچلے جا رہے ہوں، یا دوزخ کی ایک آگ گلشن ہستی کو بھسم کر رہی ہو، یا عذاب الٰہی قوم ہود یا ثمود یا لوط پر نازل ہو رہا ہو۔

یہ انسانی کرشمے تھے جس کے پس منظر میں اقوام متحدہ کے بارے میں سوچا گیا۔ اُس کے لیے بھی تیاری ضروری تھی۔ جون ۱۹۴۱ء میں "لندن منشور" جاری ہوا جس میں جنگ بندی کی متحدہ کوشش کے ذرے پائے جاتے ہیں جو ۱۴ر اگست ۱۹۴۱ء کے "اٹلانٹک، چارٹر" میں تفصیلی طور پر نمایاں ہیں۔ اس کے چند ہفتے بعد یکم جنوری ۱۹۴۲ء کو اقوام متحدہ کا اعلان کر دیا گیا۔ جس میں اس کرۂ ارض کے سبھی باشندوں کو چھبیس ۲۶ ملکوں کی طرف سے واشنگٹن میں یہ جانفزا خوشخبری سنائی کہ امن کا ایک فرشتہ تخلیق پا رہا ہے، جو نسلِ انسانی کے سبھی مہلک امراض کا علاج ہوگا، انسانی حقوق کا محافظ ہوگا۔ امن و سکون کا ضامن ہوگا۔ غربت و جہالت، نکبت و ذلت کو اِس صفحہ ہستی سے مٹانے کا ذریعہ ہوگا، اِس نورانی طفل کے آمد کی تصدیق ، ر اکتوبر ۱۹۴۴ء کو ہوئی جب کہ دھرتی کے چار عظیم الشان پالیگار، چرچل، روزولٹ، سٹالن و چیانگ

کیشنک، اپنی ایک بیٹھک میں جس کا نام ڈمبرٹن اوکس کانفرنس
ہے، انسانوں کی تقدیر میں تبدیلی کا فیصلہ کر رہے تھے۔
آخرکار ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو وہ مبارک دن آہی گیا جب کہ
نیاز دل، مرادوں وخوابوں کا وہ لعل بے بہا جس کو انسانیت
ترس رہی تھی، پھٹ سے مادرِ بشریت کی گود میں آگرا۔
اِس کے تقریباً بیس منصوبے ایک سے ایک
لاجواب ہیں۔ اقتدارِ اعلا کی کنجی حفاظتی مجلس کے ہاتھ ہے
جو قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے۔ مجلس عامہ وہ بین الاقوامی
بازار ہے جس میں ۱۸۶ر دکاندار اپنے مفاد کا سودا کرتے
ہیں۔ کرۂ ارض کے سبھی نفوس کی معاشی وسماجی حالت
کا سدھار کے ہاتھ ہے، ترقیاتی منصوبے
کے تحت، بین الاقوامی تجارت کے تحت،
حق وانصاف بین الاقوامی عدالت کے تحت، بنی نوع
انسان کی صحت کا خیال کے تحت اور عالمی سطح پر
بچوں کی دیکھ بھال کے تحت۔ ان کے علاوہ
دیگر کئی ایک ایجنسیاں ہیں جن کے ذمہ اسلحہ بندی کا کام
نشہ آور چیزوں کی روک تھام، مہاجرین کی امداد، نوآبادیات

کا انسداد، ابلتی ہوئی آبادی کی حد بندی، فضا کو مکدر نہ بنانے کی سبیل، دہشت گری کا صفایا، زلزلہ و دیگر حادثات کے شکار لوگوں کی امداد، جنگلوں کے وحشی جانوروں کی حفاظت وغیرہ وغیرہ ہے۔ اگر کہیں ان سب میں کامیابی حاصل ہو جائے تو یہ دنیا جنت بن جائے گی۔

اب ایک تنقیدی جائزہ چاہیئے کہ U.N.O اپنے پچاس سالہ زندگی میں اپنے منصوبوں میں کس حد تک کامیاب رہا ہے۔ ارادے بہت نیک، منصوبے بہت بلند، خیالات اعلا وارفع، لیکن جلد اس کی محض بحث و تکرار۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ یہ عزم راسخ لے کر اٹھی تھی کہ صفحۂ ہستی سے جنگ و جدل کا خاتمہ کر کے رہے گی۔ لیکن ہوا یہ کہ اس دنیا کو اب تک ایک نہیں پچاس ساٹھ جنگوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ عرب اسرائیل کی ایک نہیں تین جنگیں، ہندستان پاکستان کا ایک نہیں تین جنگیں، کوریا میں جنگ، ویت نام میں جنگ، الجیریا میں جنگ، لبنان میں جنگ، عدن میں جنگ، ایران میں جنگ، عراق میں جنگ، کویت میں جنگ ـــــــ، افغانستان میں جنگ، ہندستان و چین میں جنگ، کانگو میں

جنگ ، بوسینا میں جنگ ، آذربیجان میں جنگ ، چیچنیا
میں جنگ ، ہر سال جنگ ، ہر جگہ جنگ ، بد قسمتی اس بات
کہ U.N.O کے خود موجد جنگوں میں ملوث۔ امن کے ٹھیکیدار
کارزار میں موجود ، امریکہ ہو یا روس ، انگلینڈ ہو یا فرانس ،
سب کے سب طاقت کی آزمائش میں سب سے آگے ۔
اسلحہ میں کمی کی کوششوں کو لیجیے ۔ دنیا کا سب سے
بڑا دھندہ آج ہتھیار سازی ہے ، اس کی تجارت ہے ، اس
کو مزید مہلک بنانے کی تحقیق ہے ، اس کی کثرت میں اضافہ
کا شوق ہے اور اس کی صحیح نوعیت کو آزمانے کا ذوق ہے ۔
فرانس جیسا مہذب ملک بھی کل ہی ہزاروں میل دور بحرالکاہل
کے جزیروں میں عالمی احتجاج کے باوجود اپنے ایٹمی ہتھیار
کی آزمائش پر مصر رہا ۔ ان کے پاس اتنے ایٹمی ہتھیار موجود ہیں
کہ ہمارا ہی کرۂ ارض کیا ، ایسے دیگر تیس چالیس کرۂ ارض
بھی فنا ہو سکتے ہیں ۔ ان ہتھیاروں کا استعمال اس لیے
نہیں رکا ہوا ہے کہ UNO موجود ہے بلکہ اس لیے کہ وہ
اسرافیل کو ابھی سے دعوت دینا نہیں چاہیئے ۔ ہیروشیما اور ناگاساکی
کے تجربے کے بعد وہ جانتے ہیں کہ اس کے استعمال کے

کیا نتائج ظہور میں آویں گے۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

تیسری اہم بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ چند زبردست ملکوں کے قبضہ میں آچکا ہے۔ یہ ممالک زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی شان جتانے، اپنی تہذیب دوسروں پر مسلط کرنے اور اپنے مفاد کو فروغ دینے میں مگن ہیں کے بجٹ کا تین چوتھائی حصّہ مغربی ممالک کے لیے وقف ہے۔ امریکہ میں حفاظتی کونسل، فرانس میں تعلیمی و معاشی کونسل، ہالینڈ میں بین الاقوامی عدالت جینوا میں عالمی صحت کا ادارہ، اٹلی میں زراعت سے متعلقہ کونسل اور ایسی ہی دیگر تمام ایجنسیاں امریکہ و یوروپ میں پھیلی ہوئی ہیں جن کا عملہ زیادہ تر امریکی یا یوروپی ہی ہوتا ہے جن کی موٹی موٹی تنخواہیں ہی ادارے کے بجٹ کا کافی حصہ کھا جاتی ہیں اور یہ بجٹ اتنا چھوٹا ہے کہ دن کے چالیس منٹ میں اسلحہ پر جتنا خرچ کیا جاتا ہے اس کے برابر ہے اور اس بجٹ میں ہر سال کمی بھی اس لیے ہوتی ہے کہ متمول ممالک اپنا مقررہ حصّہ ادا کرنے

ہیں ہمیشہ پس و پیش کرتے ہیں۔

چوتھی اور سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ پچھلی نصف صدی سے عالم اسلام ہی ظلم وستم کا شکار رہا ہوا ہے اور اقوام متحدہ کی طرف سے اس کے روک تھام میں کوئی نمایاں قدم اٹھایا نہیں گیا ہے۔ امریکہ ہمیشہ اسرائیل کا حامی رہا ہے، جس خطۂ زمین پر ۹۲ فیصد مسلمان اور ۸ فیصد یہودی تھے وہاں اسرائیلی ریاست ٹھونس کر U.N.O سے مسلمانوں پر ایک ظلم عظیم برپا کیا ہے۔ مسلمانوں کا پہلا کعبہ" بیت المقدس"، جو سینکڑوں سال سے مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ U.N.O کی وجہ وہ آج اسرائیلیوں کے ہاتھ میں ہے۔ فلسطینوں اور عربوں پر یہودی جو ظلم ڈھا رہے ہیں اس کے ازالہ میں U.N.O کا اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا کہ بھیڑ کو بھیڑیا چیرتے وقت لومڑی کی موجودگی کا۔ لبنان سے یا سرعرفات کو بھگایا گیا اور U.N.O خاموش دیکھتا رہا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں جو حصے اسرائیل نے دبا رکھے وہ ابھی تک واپس نہیں کیے گئے۔ ایران، عراق دس سال لڑتے رہے U.N.O کوئی مصالحت پیش نہ کرسکا۔ عالم اسلام پر جہاں کہیں ظلم ہوا U.N.O مزے سے نظارہ ہی

کرتا رہا۔ اگر وہاں جنگیں ختم ہوئیں تو U.N.O کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ خود جنگ کرتے کرتے تھک کر صلح پر آمادہ ہو گئے۔ بالفاظ دیگر U.N.O فقط تماشائی ہی رہا۔

پانچویں بات یہ ہے کہ U.N.O کی طرف سے غریب ملکوں کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اِن غریب ملکوں کے وسائل کو لوٹا جا رہا ہے۔ اُن کو اپنے دام فریب میں لایا جا رہا ہے، ان میں آپسی رسہ کشی و نفاق کو بڑھایا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے سے لڑانے کے لیے انھیں ہتھیار فروخت کر کے ان کی ساری دولت کو لوٹا جا رہا ہے۔ ان ملکوں کو اپنی چمک، دمک اور غیر ضروری چیزوں کو کھپانے کے لیے مارکٹ بنایا جا رہا ہے، وہاں کے ارباب حکومت کو اپنے زیر اثر لاکر اپنا اُلو سیدھا کیا جا رہا ہے۔ ان کی عزت، غیرت، اخلاق، عادات، رہن سہن، تہذیب و تمدن سب پر اثر انداز ہو کر ان کی انفرادیت کو ڈھایا جا رہا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور U.N.O کی بلّی آنکھ بند کر کے دودھ پیئے جا رہی ہے۔

لہٰذا U.N.O چند طاقتور ملکوں کو اپنی من مانی کرنے

اور اپنی دھاک بٹھانے کا پاسپورٹ بن گیا ہے ۔ حق و انصاف کو اپنے خصوصی اختیار کے استعمال سے کچلنے کا ذریعہ بن گیا ہے ۔ اپنے مفاد کے لیے عوام کو دام فریب میں رکھنے کا مرکز بن گیا ہے ۔ یہ سب کیوں ؟ اس لیے کہ اِن کا ضمیر پاک نہیں ہے ، اِن کی نیت نیک نہیں ہے ۔ یہ خود کے لیے ایک قانون اور دوسروں کے لیے دوسرا قانون بناتے ہیں ، اپنا اجارہ داری قایم رکھنا چاہتے ہیں ۔ ان کا رہنما نیٹشے ہے جس کی تعلیم جبر واستبداد تک لے جاتی ہے ۔ ان کا آقا ڈارون ہے جس نے زیست کا راز قوت وطاقت بتایا ہے۔ اِن کی آنکھ پر خود غرضی ، خود پسندی و خود فریبی کی عینک ایسے چسپاں ہے کہ آنکھیں صرف وہ نظر آتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں ان کی حرص و طمع ، عیش وعشرت ، دولت و ثروت کا گھمنڈ ، ملک گیری واقتدار کی ہوس اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے لیکن ان کے اخلاق کی کمزوری ایسی ہے کہ بے دھڑک و بانگ دہل یہ اعلان بھی نہیں کرتے کہ وہ کیا چاہتے ہیں ۔ اس لیے U.N.O کی ٹٹی کے آڑسے شکار کھیلتے ہیں ۔

اس کا علاج کیا ہے ؟ سیاست نہیں ، انسانیت

ہے ۔ بحث و تکرار نہیں، صالح کردار ہے ۔ ظاہری جمیت کا لبادہ نہیں، حقیقی و مساوات و اخوت کا مظاہرہ ہے ۔ نیک ارادے و منصوبے ہی نہیں بلکہ ان کی تکمیل بھی ہے ۔ دوسروں کو ہدایت و تلقین ہی نہیں، بلکہ خود پر پابندی عاید کرنا ہے ۔ انسانی تاریخ ایسے عمل سے خالی ہے بہ استثنائے چند سال جو رسول اکرمؐ و خلفائے راشدین کا زمانہ تھا ۔ شاید اس پیغام کو پھر سے عملی جامہ پہنایا جائے تو ممکن ہے کچھ امید ہو ۔ صالح نظام حیات، خلقت کی وحدت کو تسلیم کرنے، انسانیت کو عملی جامہ پہنانے، اخوت و مساوات کو عام کرنے، ایثار و قربانی کا صحیح جذبہ ابھارنے، حق و انصاف کو سختی سے نافذ کرنے، تلاش حق و خدمت خلق کے مفہوم کو سمجھنے اور ایک مثالی کردار جیسے رسول اکرمؐ کی زندگی کو نمونہ بناتے ہیں مضمر ہے ۔ اس کے لیے سیاسی و معاشی جذبہ نہیں ۔ روحانی و نورانی جذبہ چاہیئے جو شاید اسلام دے سکے ۔

لبالب شیشہ تہذیب حاضر ہے مئے "لا" سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں ہے پیمانہ "الا"

دنیا میں امن کے لیے کیا چاہیئے؟ خون چاہیئے

ازل سے دیکھا گیا ہے کہ امن کے لیے عظیم قربانی چاہیئے۔ ۵ رنومبر ۱۹۹۵ء کے دن اسرائیل کے وزیر اعظم کو قتل کر دیا گیا۔ یہ معمولی شخص کا قتل نہیں، اُس قوم کے سردار کا قتل جو گو کہ گنتی میں مٹھی بھر ہے، لیکن سیاست کے شطرنج کے بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس قوم کے وزیر اعظم کا قتل، جو علم و عمل، عقل و شعور، ذہانت و فراست، ہمت و حوصلہ، و محنت و جفاکشی میں ید طولیٰ حاصل کر چکی ہے اس قوم کی تقدیر بدلنے والے کا قتل جو اِس میدانِ کارزار میں کود کر مور بے مایہ کو ہمدوش سلیمان کرنے کا خواب دیکھا تھا، ممکن ہے اُس کے خون سے اِس کرۂ ارض کے تین مقدس مذاہب کی سرزمین پر تعصب کی آگ

جو بھڑک اٹھی ہے وہ ٹھنڈی ہو۔ ممکن ہے کہ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے وجود سے آج تک جو خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے، اس میں کمی ہو۔ ممکن ہے کہ امن کے لیے ترستی و بلکتی انسانیت کی دعا حضورِ حق میں مقبول ہوئی ہو۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ گناہوں کے انبوہ کا کفارہ فردِ واحد کے خون سے نہ دُھلے اور دوزخ کی آگ پھر "ھَلْ مِنْ مَّزِیْد" پکار رہی ہو۔

غور سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ امن اور خون میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نمرود و فرعون و قارون سے حقانیت دبی نہیں، پھر ابھری۔ حضرت ذکریاؑ و یحییٰؑ و عیسیٰؑ کے خون سے کلمۃ الحق پھر سے فروغ پایا۔ سقراط کے خون سے یونانی تہذیب کا چراغ پھر بھڑک اٹھا۔ "قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"۔ ٹیپو سلطان شہیدؒ نے اس خطہ پر اپنا مقدس خون بہا کر اس کے ذروں کو منور کر دیا۔ موجودہ صدی میں ایک نہیں دو جنگِ عظیم برپا ہوئیں جب کہ خون کی ندیاں بہہ گئیں، لیکن امن کی جستجو بھی شروع

ہوئیں، اقوامی لیگ وجود میں آئی اقوام متحدہ قایم ہوئی۔ دیش
کے نیتا گاندھی جی مارے گئے، مسلمانوں پر ظلم کا طوفان کچھ
تو تھا۔ کینڈی مارے گئے، مگر امریکہ کے کالے باشیوں
کو کچھ تو شہری حقوق ملے۔ یعنی ہر قربانی فضیلت سے
خالی نہیں اسی طرح ممکن ہے اسرائیل کے وزیر اعظم کا
خون اُس خطہ کے لیے امن کا پیغام لے آئے۔

آیندہ جو ہوگا وہ مشیت کے ہاتھ ہے، لیکن
اب جو ہوا اس پر تبصرہ چاہیئے۔ اوّل یہ کہ ہر شخص کو
میر تقی میر کے یہ دو اشعار یاد ہوں تو بہتر ہے ؎

پڑی نظر جو گورِ سلیمان پہ ایک روز
کوچہ پہ اُس مزار کے تھا یہ رقم ہوا
کہ اے سرکشاں جہاں ہیں کھینچا تھا ہم بھی سر
پایانِ کار مور کے نقش قدم ہوا

حضرت سلیمان جیسے جلیل القدر پیغمبر جن کی حکومت انسانوں
پر ہی نہیں بلکہ کائنات کے عناصر پر بھی تھی، ان کی قبر
سے یہ آواز آرہی ہے کہ اُن کی روح ان ادنا کیڑوں
کا مقابلہ بھی نہ کر سکی جنھوں نے اُن کی لاٹھی کو اندر رہی

اندر سے کرید کرید کر اتنا کمزور کر دیا کہ وہ نیچے گر گئے اور چل بسے۔ عبرت کا مقام ہے کہ حضرت سلیمان، جیسے مقبول خدا کا وہ حال ہوا تو اسرائیل کس کھیت کی مولی ہے جو اتراتا ہے۔ اے انسان سبق سیکھ کہ سرکشی کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ شاید کہ میرؔ کی اس نصیحت کو بھی ہم بھول نہ جائیں گے۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ راہ دیکھ کے چل اے بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مالک کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ حق و انصاف کی ہی جیت ہوگی۔ انسان میں صبر و استقلال، چاہیئے۔ جہاں ضمیر پاک ہو، نیت نیک ہو، دل صاف ہو اور بندہ حق پر ہو، وہاں غیبی تائید ضرور حاصل ہوتی ہے۔ یہ وعدۂ حق ہے۔ جو مسلمان صداقت کا عاشق ہو، حقانیت کا دلدادہ ہو، عدالت کا نگراں ہو، اور حریت کا پرستار ہو، وہ فیضانِ سماوی سے محروم ہو نہیں سکتا۔

ظلم وتشدد، غرور وتکبر، اقتدار و بالادستی کا قرار قایم نہیں رہتا۔ عزت و دولت آنی جانی ہے، مِل مِل جائے، چھن چھن جائے۔ عربوں اور فلسطینوں کو یاد رکھنا ہوگا کہ کتنی بلندیاں تھیں جو گرِ گرِ کر پست ہوگئیں اور کتنی ہی پستیاں تھیں جو اُٹھ اُٹھ کر بلند ہوگئیں یہ سبق ہمیں قرآن شریف میں ملتا ہے۔ اگر آج اسرائیل بلند ہے تو کل پست ہوگا اور اگر آج عرب پست ہے تو کل بلند ہوگا۔ یہ قانون قدرت ہے، اس میں چوں چرا کی گنجائش نہیں۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ ہر قوم نے اپنے حقوق جدوجہد کر کے حاصل کیے ہیں، اسرائیل نے بھی۔ یہ حقوق آسمان سے نہیں ٹپکے۔ ان کے لیے جدوجہد اور کوشش ضروری ہے۔ ہر آزمائش سبق سکھاتی ہے۔ قوموں میں انقلاب ظاہری باتوں سے نہیں، بلکہ دل ودماغ کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے جس کے لیے ہمّت و حوصلہ چاہیئے، جوش و ہوش چاہیئے۔ صبر واستقلال چاہیئے۔ جدوجہد چاہیئے۔ جو قوم حق وحکمت کے حصول میں مگن ہے، وہ میدان جیت جاتی ہے۔ عربوں کو

اسرائیل سے یہ سبق سیکھنا چاہیئے کہ وہ حکمت کے سہارے، علم وعمل کے سہارے، ترقی کی منزلوں پر گامزن ہیں، چونکہ وہ حق وصداقت سے دور ہیں، آخری جیت عربوں کی ہی ہوگی، بشرطیکہ عرب علم وعمل اور حق وحکمت پر بھی ہوں۔ یہاں حکمت سے مراد وہ علوم وفنون، ذہن و فراست، سیاست ومعاشیات ہیں جو عقل برہانی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے انسان عناصر پر حکومت کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔ لیکن جب تک اس عقل بُرہانی کے ساتھ عقل ظاہری وعقل روحانی نہ ہو، انسان بھٹکتا ہی رہے گا اور اس کا وہی حشر ہوگا جو اسرائیل کے وزیر اعظم اسحٰق رابن کا ہوا۔

آخری اہم بات یہ ہے کہ انسان موت کی تلاش نہ کرے۔ موت ہر شخص کا حصّہ ہے وہ آہی جائے گی۔ انسان تلاش اُس راہ کی کرے جس سے موت حیات جاودان کا پیغام سنائے، موت زندگی کو کامیاب بنا دے۔ اسحٰق رابن کی پچھلی زندگی چاہے جیسی بھی ہو، اس کی موت

اسس کو امر بنا رہی ہے۔ وہ ایک مقصد کے لیے
جیا جو اپنی قوم کے نزدیک صالح تھا، اور وہ ایک مقصد
کے لیے مرا جو انسانیت کے نزدیک صالح ہے۔ انسان
کی آخری تو یہ ہی نجات کا باعث بنتی ہے۔ امن کے
نام پر رابن نے اپنی جان دے دی اور مقبول بندوں
کی فہرست میں آگیا۔ تاریخ اس کو اب بھلا نہیں
سکتی۔

اسحٰق رابن کی موت کیا کہہ رہی ہے ؟

ایسا لگتا ہے کہ اسحٰق رابن کی موت کے بعد مشرق وسطیٰ وہ نہیں رہے گا جو ۴ نومبر سے پہلے تھا ــــ ساحران مغرب کے بیج کا وہ پروردہ درخت جو مضبوط و تناور ہو چکا تھا، اُس کی جڑیں اب ہِل گئیں ہیں۔ اسرائیل کے ہر گھر میں اب یہ چرچا ہے کہ اب یہاں سے کہاں؟ سنہرے خوابوں کی وہ دنیا جو عربوں کی سرزمین کو ہضم کر کے "اسرائیل عظیم" کی شکل میں دیکھی جارہی تھی، وہ اب چکنا چور ہوگئی۔ اسرائیل کی سیاست میں اب پھوٹ ہے، اُس کی ریاست میں اب تفرقے ہیں، اُس کی پارٹیوں میں اب اختلاف ہے، اور اُس کے عوام میں اب انتشار ہے۔ قدرت کے قانون میں حق، حق ہی ہے۔ ناحق کیسے

پھلے گا، پھولے گا؟

اسرائیل کے مدبروں کو اسحٰق رابن کی موت اب یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ اسرائیل اپنی بلندیوں کے آخری زینہ پر پہنچ گیا ہے اور وہاں سے مزید رفعت ممکن نہیں۔ وہ اگر پستی کی طرف پھسل نہ پڑے تو وہی غنیمت ہے۔ اُس کے لیے اب ایک ہی راستہ کھلا ہوا ہے جو سلامتی کا ہے۔ وہ امن ہے، مصالحت ہے، سمجھوتہ ہے، حق والنصاف کا احترام ہے۔ اگر اِس راستہ سے وہ ہٹ گیا تو مزید تباہی و بربادی۔ اسرائیل کے چند بداندیش اب بھی زمین کی ہوس میں لگے ہوئے ہیں۔ اُنھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جیسے جسم کے قویٰ ضرورت سے زیادہ غذا ہضم نہیں کر سکتے، اسی طرح کسی قوم کی حرص و ہوس کی بھی انتہا ہوتی ہے اور وہ جب حد سے تجاوز کر جاتی ہے، تو عذاب الٰہی کا شکار بن جاتی ہے۔

دوسری اہم بات جو رابن کی موت کہہ رہی ہے وہ یہ ہے کہ مہذب اقوام جو دہشت گردی کے انسداد کے

پلے نکلی تھیں۔ وہ خود اس کو اب ہوا دے رہی ہیں۔ رابن کا قاتل عرب نہیں تھا، یہودی ہے۔ یہودی کا زعم کہ ایک یہودی دوسرے یہودی کو قتل نہ کرے گا، اب خاک میں مل گیا ہے۔ کینیڈی کے قتل کے بعد، سویڈن کے وزیرِاعظم آلف پالمے کے قتل کے بعد اور اسرائیل کے وزیرِ اعظم اسحٰق رابن کے قتل کے بعد ساحرانِ مغرب کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ اُن کا دامن دہشت گردی سے پاک ہے؟ اُن کا دیگر نمونہ سے خون چوسنا الگ تھا اور "یہ علم، یہ تدبیر، یہ حکمت، یہ حکومت ٭ پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات" اب یہ اِس مقام سے بھی نیچے گر کر وحشی درندوں سے تجاوز کر کے خود اپنے آپ کا خون پینا بھی شروع کر دیتے ہیں۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ رابن کی موت یہ صاف بتا رہی ہے کہ اسرائیل عربوں کی فوج سے لڑ سکتا ہے۔ اُنھیں میدانِ جنگ میں شکست دے سکتا ہے، صنعتی، تجارتی، زرعی، سیاسی یا ثقافتی شعبوں میں اُن سے سبقت لے جا سکتا ہے، لیکن اُن کے جذبہ حریت

کو مٹا نہیں سکتا۔ ان کی ہمت و حوصلہ کو پست نہیں کر سکتا، اُن کے دینی و مذہبی افتخار پر کیچڑ اچھال نہیں سکتا۔ ملتِ اسلامیہ میں اب بھی وہ توانائی و دانائی موجود ہے۔ جو شاید دشمن سے تو شکست کھائے مگر اپنے ضمیر پاک کا سودا نہیں کرے گی۔

چوتھی اہم بات یہ ہے کہ قوموں کی قسمت کا فیصلہ تیر و خنجر و تیغ و توپ سے نہیں ہوگا بلکہ اُن کے ایمان والیقان کی مضبوطی سے ہوگا۔ رابن کی زندگی کا وہ دن بہت اہم تھا۔ جب وہ جان گیا کہ اسرائیل جذبوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ بچوں کے پتھروں کو روک نہیں سکے گا، نوجوانوں کے جوش کو دبا نہیں سکے گا۔ عورتوں کے حقارت آمیز جملوں کو سہہ نہیں سکے گا۔ ہزاروں نفوس کے دل و دماغ کو بدل نہیں سکے گا۔ عوام کے جذبہ حریت کو ٹھنڈا نہیں کر سکے گا۔ یہ غضب کی آگ تھی جو برق و باراں سے زیادہ ہولناک تھی۔ یہ طیر ابابیل کا نمونہ تھا۔ یہ بدر و حنین کا خاکہ تھا۔ یہ حق و باطل کا مقابلہ تھا، یہ قوت ایمان کا اشتہار تھا۔ یہ وہ عزم راسخ تھا، جو تلوار

سے تیز، توپ سے زیادہ خوفناک اور ایٹمی بم سے
زیادہ موثر تھا۔ رابن جو خود بہت دور اندیش تھا، چکرا گیا۔
اس کے سامنے ایک ہی راہ تھی، یا سرعرفات سے سمجھوتہ!
پانچویں اہم بات یہ ہے کہ رابن کی موت پر اقوام
مغرب کے سرداروں کا جم غفیر اس بات کی شہادت
دے رہا ہے کہ صلیبی جنگ کا آغاز جو اسرائیل کے وجود سے
شروع ہوا تھا، اب تک مسلسل جاری ہے۔ عربوں کے معاملے
میں مغرب ہمیشہ اسرائیل کی پشت پناہی کرتا رہا۔ ہمیشہ اس
کے اسلحہ خانوں کو نت نئے قیامت خیز ہتھیاروں سے
آراستہ کرتا رہا۔ اس کی خامیوں، گستاخیوں پر ہمیشہ پردہ
ڈالتا رہا۔ معصوموں پر اُس کے ظلم وستم کو ہمیشہ نظر انداز
کرتا رہا۔ اُس کے غرور وتکبر، جبر واستبداد، خونریزی و
چنگیزی کو ہمیشہ طوطا چشمی سے ٹالتا رہا۔ اصل بات تو یہ
ہے کہ اسرائیل سے بڑھ کر ملت اسلامیہ کا حریف مغرب
ہے۔ اسرائیل کی ٹٹّی سے وہ شکار کھیل رہا ہے، تہذیب
دین محمدیؐ کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ چودہ سو سال سے
جو خصومت چلی آرہی ہے، اُس کو نئے رنگ میں ڈھال

رہا ہے۔ عالم اسلام کا اصلی حریف اسرائیل سے دور بیٹھا ہے اس لیے مغرب کے پٹھو کی جب موت ہوئی تو سارا مغرب حیران و پریشان رہا۔ اُس کے سارے سردار حتیٰ کہ شہزادہ چارلس بھی جنازے میں شامل ہوئے۔ گویا رابن کی موت مغربی چال کی موت تھی۔

اب عربوں کا ردعمل دیکھیے۔ شانِ اسلام یہ ہے کہ دشمن کو بھی گلے لگالے۔ اردن کے حسین سے بڑھ کر کسی نے رابن کو خراج تحسین نہیں پیش کیا۔ وہ جذبات میں بہہ گئے اور کہا " حق جو کہے ہے اُس کو یاں دار کھینچتے ہیں "۔ اپنے دادا کی مثال دی اور اِس اندیشہ کا بھی اظہار کیا کہ گولی کے وہ بھی منتظر ہیں۔ کسی دن وہ بھی رابن سے جا ملیں گے۔ اللہ اکبر۔ یہ اُس شخص کے احساسات ہیں جس پر اسرائیل ہر دم، ہر آن چھری بھونکتا تھا۔ اردن کے تاجدار سے بڑھ کر یاسر عرفات کو لیجئے۔ یاسر پر جو مظالم توڑے گئے اس کا عشر عشیر بھی حسین کے حصہ میں نہ گیا۔ اسرائیل کی ریاست میں عرفات کا نام شیطان کے مترادف تھا۔ غریب کو فلسطین میں کچا، لبنان میں بھی

رہنے نہ دیا گیا۔ ایسے شخص کے دل میں ایسے قہر قہار
دشمن کی موت پر وہ جذبات ابل پڑتے ہیں جو اسلام
کی شان وشوکت میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ یاسر جانتے
تھے کہ آخری وقت تک بھی رابن کے دل ودماغ پر فلسطینوں
کے خلاف نخوت ہی نخوت تھی۔ وہ یاسر کو حبیب یا رفیق
نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ حریف ورقیب سمجھتے تھے۔ سمجھوتہ
اس لیے کیا تھا کہ چارہ نہیں تھا۔ مصر کے مبارک، اردن
کے حسین اور فلسطین کے عرفات کے علاوہ بھی دیگر عرب
ملکوں کے سربراہ اس غم میں شریک تھے اس لیے کہ اسلام
کا نورانی سبق ہے کہ دشمن کی موت پر اس کے سب
پچھلے کرتوت بھلا دو، اور اگر اس میں رمق بھر نیکی بھی
ہو تو اس کو یاد رکھو۔

آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اے آل ابراہیم
قرینۂ خلیل سیکھو، صدق خلیل نہ بھولو۔ اپنے جد امجد
کو رسوا نہ کرو۔ عرب واسرائیل آپس میں بھائی بھائی
ہیں۔ ایک ہی جڑ کی دو شاخیں ہیں۔ ایک ہی
قبیلہ کے دو گروہ ہیں۔ ایک ہی نبی کی دو اولادوں

کے پیرو ہیں، دونوں ایک ہی خالق کے بندے ہیں۔
دونوں ایک ہی خدا کو ماننے والے ہیں، اور دونوں ایک
ہی مالک کی عبادت کرنے والے ہیں۔ تم دونوں ایک
کیوں نہیں ہو جاتے؟ آپسی نفرتے کیوں نہیں مٹا ڈالتے؟
پچھلی سختیاں کیوں نہیں بھول جاتے؟ اور کیوں شیر و شکر
نہیں ہو جاتے؟ راہن کی موت چیخ چیخ کر یہی دعوت
دے رہی ہے۔

عجز بندگی کی ایک بے نظیر مثال

انسان آج تک اِس سوال کا اچھی طرح جواب نہ دے سکا کہ زندگی کا ماحصل کیا ہے ؟ کسی کے نزدیک یہ علم و ادب کی تحصیل ہے اور کسی کے نزدیک مال و دولت کا حصول، کوئی عقل و شعور میں غرق ہے، کوئی عیش و عشرت میں مست، کوئی الفت و پیار کا دیوانہ ہے اور کوئی جنگ و شکوہ کا دلدادہ۔ کسی کے پاس جاہ و حشمت کی عظمت ہے اور کسی کے پاس حکومت و اقتدار کی۔ کسی کو یادِ الٰہی سے عشق ہے اور کسی کو غار و کوہ سے رغبت۔ غرض زندگی کے تصورات جدا جدا ہیں۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سارے تصورات یں تکمیل بشر پائی نہیں جاتی ہے

تکمیلِ بشر نہیں ہے سلطان ہونا
یا صف میں فرشتوں کے نمایاں ہونا
تکمیلِ بشر ہے عجز بندگی کا احساس
انسان کی معراج ہے انسان ہونا

لہٰذا زندگی کا عین مقصد عجز بندگی کا کمال ہے۔ یہ عجز بندگی ہے کیا؟ اس کی تشریح ہمیں صحیفۂ پاک میں ملتی ہے۔ اس کی توضیح اسوۂ حسنہ میں ہمیں ملتی ہے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ خالق کی وحدت کا رشتہ خلقت کی وحدت سے جڑتا ہے، جہاں دین حق کا مدعا خدمت خلق بتایا گیا ہے۔ جہاں ہمدردی و انسانیت کو دین و ایمان کا درجہ دیا گیا ہے۔ جہاں ایثار و قربانی کو مردِ مومن کی عبادت کہا گیا ہے۔ جہاں خدمت خلقِ خدا کو عز و شانِ انبیاء کا رتبہ بخشا گیا ہے، جہاں صدق و صفا اور اہلِ وفا کی نشانیاں خلقت سے محبت و مروت بتائی گئی ہے اور جہاں مالک کی رحمت کی شرط بندوں سے الفت و پیار پہ رکھی گئی ہے۔

یہ عجز بندگی کا آج کل کیا حال ہے؟ یہ قریب الختم

یا بالکل مفقود نظر آتی ہے۔ کہیں لاکھوں کروڑوں نفوس میں کسی کے پاس اگر یہ موجود ہو تو اُس کی عزت و احترام، توقیر و تشہیر ہم پر لازمی ہے۔ خوش قسمتی کا مقام اور ہماری مسرت کی انتہا کہ یہ گوہر نایاب ناپید نہیں۔ ہم میں ہی ایک ایسی ہستی موجود ہے جو عجز بندگی کی ایک بے نظیر مثال ہے اور اس کا نام نامی ضیاء اللہ شریف ہے۔ یہاں اِس "عجز بندگی" کے بارے میں دو چار باتیں بتانا مطلوب ہے۔

موصوف اسمِ بامسمیٰ ہیں۔ شریف النفس ہی نہیں بلکہ سلیم الطبع و حلیم المزاج بھی ہیں۔ طبیعت میں ریشم جیسی نرمی، پھول جیسی نزاکت اور بچوں جیسی معصومیت ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ انسانوں میں زر کے ساتھ زور بھی آجاتا ہے، کچھ غرور و تکبّر بھی ٹپک پڑتا ہے، کچھ اترانا وکترانا بھی آجاتا ہے، لیکن اِس نیک ہستی کا خمیر ہی جدا ہے۔ دولت اتنی کہ لوگ حسرت کریں، مگر عاجزی و انکساری، پاک دلی و پاکبازی ایسی کہ فرشتے رشک کریں۔ گفتگو ایسی کہ پھول شرما جائیں۔ غرض کئی خوبیاں اِن کی گھٹی میں آئی ہیں، لیکن صرف ان خوبیوں کی وجہ وہ "عجز بندگی" کا شرف

نہیں پاتے۔ اس کے لیے کچھ اور چاہیئے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جن میں شرافت کے موتی موجود ہیں، وہاں مال و دولت کی کمی ہے۔ جہاں مال و دولت کی کثرت ہے، وہاں شرافت عنقا ہے۔ جہاں شرافت و دولت موجود ہوں وہاں سخاوت کا جذبہ نہیں۔ جہاں یہ تینوں ہوں، وہاں ایمان مفقود ہے۔ موصوف کا محل اِن چاروں ستون سے مضبوط ہے۔ یہاں شرافت بھی ہے، دولت بھی ہے، سخاوت بھی ہے اور ایمان واسلام و احسان کا جذبہ بھی ہے۔ اِن چاروں کے امتزاج سے ہی "عجز بندگی" کا گلدستہ بنتا ہے اور اِس گلدستہ کا نام ضیاء اللہ شریف ہے۔

شرافت صحبت کا اثر ہے، دولت محنت کا پھل ہے، سخاوت ضمیر کی آواز ہے، لیکن ایمان واسلام و احسان اللہ کی دین ہے۔ اور صاحب موصوف اِس دولتِ عرفان سے مالا مال ہیں۔ اِسی دولتِ عرفان کے صدقے اِن میں ایک ایسا جذبہ باہمی، کشش بشریت و جوہرِ انسانی پیدا ہو چکا ہے جو اپنی دولت کو ملتِ بیضا

کی بہبودی پر بے دریغ خرچ کر رہے ہیں۔ اسی دولتِ عرفان کے طفیل اُن کے سینہ میں وہ دردِ انسانی موجزن ہے جو ملت کی زبوں حالی پر تڑپ اٹھتا ہے اور اپنی سخاوت کی دریا بہانے پر مجبور کر دیتا ہے یہی وہ جذبہ ہے جو بندوں کو مالک سے ملاتا ہے، جو ایمان کی جڑ ہے، اسلام کا پھل ہے، احمد مجتبیٰؐ کا ارشاد ہے، آخرت کا توشہ ہے اور ملت کی آبرو ہے۔

صاحب موصوف اس جذبہ سے سرشار ہیں۔ اپنی صلاحیت، دولت، ثروت، اثر رسوخ، سب کچھ ملت کے اُس کھیت میں بو رہے ہیں، جہاں اُن کی سخت ضرورت ہے، کہیں لاکھوں کی لاگت کا بچوں کا گھر (بیت الیتمیٰ) بنا دیا۔ کہیں بزرگوں کا گھر (مجبور ضعیفوں کے لیے) کہیں سکول، تاکہ صحیفۂ پاک کے "اقرا" "وَعَلَّمَ بالقلم" کی تعمیل ہو۔ کہیں ہوسٹل تاکہ طالبانِ علم کو سکونت گاہ ملے۔ کہیں شادی محل تاکہ تقاضائے بشریت وسنتِ رسولؐ کی پیروی ہو۔ کہیں غریب بچیوں کی شادی کا انتظام تاکہ غربت کی وجہ یہ کلیاں بن کھلے مرجھا نہ جائیں۔ کہیں

بیواؤں کی امداد تاکہ یہ ستم زدہ بہار کے دو دن تو دیکھ لیں۔ کہیں تعلیمی امداد تاکہ نادار بچے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں۔ کہیں مسافر خانہ تاکہ ضرورت مندوں کو سفر میں سہارا ملے۔ کہیں شفاخانہ تاکہ غربا تنگ دستی کی وجہ سے اپنی صحت نہ کھو بیٹھیں۔ کہیں بغیر سود کے قرضہ تاکہ عہدزریں و قرونِ اولیٰ کی یاد تو تازہ ہو جائے۔ کہیں حاجت مندوں و غریبوں کے لیے چھت کا سہارا تاکہ وہ کھلے نیلگوں آسمان کے تلے نہ پڑے رہیں۔ وغیرہ وغیرہ کا کام انجام دینا انھوں نے شروع کیا ہے، کئی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں، چند کا آغاز ہونے والا ہے۔ یہ سب حسنات جاریہ کا کام ہے جس کے لیے لاکھوں کا نہیں کروڑوں کا سرمایہ چاہیئے۔ یہ اپنے صرف خاص سے عنایت فرمارہے ہیں۔ ایک انقلابی لائحۂ عمل تیار کر چکے ہیں جس سے ملّت میں ایک نئی روح پھونکنا مقصود ہے۔ غربت، نکبت و جہالت دور کرنا مطلوب ہے۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ اگر ملت میں اور چند ضیاء اللہ شریف موجود ہوں تو ملت کی کایا پلٹ

سکتی ہے ۔ اربابِ دولت وصاحبِ علم وفضل اپنی ضمیر کو ٹٹولیں اور پوچھیں کہ آیا وہ بھی ایسے ہی لائحہ عمل پر عمل پیرا ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو کیوں نہیں ؟ کیا ہر مسلمان کا فرض نہیں کہ اپنے بھائیوں کا خیال رکھے ؟ کیا وہ مومن ہو سکتا ہے جو جو خود کھائے ، اوروں کو نہ کھلائے ؟ خود عالم ہوں اور دوسرے جاہل ۔ خود امیر ہوں اور دوسرے فقیر ۔ یہاں یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ ہر شخص ضیاء اللہ شریف بنے ، بلکہ یہ کہ کچھ تو دردِ انسانی ہو ۔ اپنے عیش وعشرت کے لیے سب کچھ موجود ، لیکن دوسروں کے لیے کچھ نہیں ۔ اپنی اولاد کے لیے اپنی جان قربان ، ملت کے سسکتے بلکتے بچّوں کے لیے کچھ نہیں ۔ اپنی بچیوں کی شادیوں پر لاکھوں کا اسراف مگر یتیموں و بیواؤں کی مدد کے لیے کچھ نہیں ۔ یہ سب کہاں روا ہے ؟

آخر میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ہم ضیاء اللہ شریف صاحب سے کیا سیکھ سکتے ہیں ؟ اول یہ کہ انسان خوب کمائے ، خود کھائے اور دوسروں کو بھی کھلائے ۔ دوم یہ کہ دولت آسانی سے ہاتھ نہیں آتی ۔ اِس کے

لیے محنت چاہیئے۔ مشقت چاہیئے۔ ذہن چاہیئے، حوصلہ چاہیئے، ہمت چاہیئے، صبر واستقلال چاہیئے، دُور اندیشی وہشیاری چاہیئے، اور سب سے بڑھ کر مالک کی کرم وعنایت چاہیئے۔ سوم یہ کہ انسان اوصاف حمیدہ پیدا کرے۔ خوش مزاج وخوش اخلاق، رحم دل و نیک بنے۔ محبت ومروّت، ہمدردی وانسانیت، عاجزی وانکساری، بردباری وتحمل سیکھے۔ ایثار وقربانی، صداقت و سخاوت، حق وانصاف، پاک بازی و پاک دلی کی عادت ڈالے، اور نیکی کے نقوش وخدمت خلق کا جذبہ پیدا کرے۔ یہ سب صفات صاحب موصوف میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ چہارم یہ کہ انسان خود کے لیے نہیں، اوروں کے لیے زندہ رہے۔ کائنات میں ہر شئے کسی دیگر شئے کے لیے مخصوص ہے۔ چاند، سورج، شجر، حجر، مرغ ماہی، پہاڑ ندی، آسمان زمین سب کچھ اِس غرض سے پیدا کیے گئے ہیں کہ جن سے دوسروں کا فائدہ ہو۔ صرف انسان کی واحد ہستی ایسی ہے جو خود کے لیے جیتی ہے اور دوسروں سے بے جا فائدہ اٹھاتی ہے۔

ہر وقت انسان اپنی روزی، اپنی روٹی، اپنا کھانا، اپنا پہننا، اپنا آرام، اپنی آرائش، اپنی زیبائش، اپنی دولت اور اپنی ثروت پر زیادہ توجہ برتتا ہے اور دوسروں کا خیال نہیں کرتا۔ ضیاءاللہ شریف صاحب میں یہ بات نہیں۔ وہ دوسروں کا حد درجہ خیال رکھتے ہیں۔ یہی اُن کی بڑائی ہے۔
پنجم یہ کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ کی امانت ہے۔ امانت میں خیانت گناہ ہے۔ یہ نہ سوچنا چاہیئے کہ میں نے اپنے زور بازو سے اکٹھا کیا ہے۔ یہ اللہ کی دین ہے۔ وہ اگر چاہے تو چشم زدن میں آپ کی دولت و عزت کو واپس لے سکتا ہے۔ اس امانت میں دوسروں کا بھی حصّہ ہے۔ زیادہ نہ ہو تو کم از کم ہر چالیس روپیوں میں ایک روپیہ۔ اتنا بھی نہ دیں تو امانت میں خیانت ہوگی۔ یہ ٹیکس آپ ادا نہ کریں تو قدرت جانتی ہے کہ وہ کیسے اپنا حصّہ لے۔ ڈاکٹروں کی زنبیل میں، وکیلوں کے جیبوں میں، اولاد کی فضول خرچی میں، بیکار آلائشی دھندوں میں، یہ دولت صرف ہونے کے علاوہ

خوشنودئ خداوندی سے بھی محروم رکھے گی۔ ضیاء اللہ شریف صاحب اس امر میں بہت محتاط ہیں۔ اِسی لیے راہِ حق میں اپنی فیاضی کے جوہر بتا رہے ہیں۔ اِسی لیے وہ شاداب وشاداں ہیں۔ دعا ہے کہ مالک ان کی عمر دراز کرے، ان کی دولت وثروت میں اضافہ کرے، ان کو صحت وعافیت وحشمت وجاہ سے نوازے، ان کے ہر نیک ارادے کو کامیابی کا شرف بخشے اور ان کا سایہ تا دیر قایم رہے تاکہ ملت اسلامیہ کا اُن کے دم قدم سے ہر وقت بول بالا ہوتا رہے، آمین ثم آمین۔

یارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
کام کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

ملناڈ کے "سرسید"

قدرت دنیا کے کسی خطّے کو بھی اپنی نعمتوں سے محروم نہیں رکھتی۔ اِسی لیے ہمارا ایمان ہے کہ ہادی و رسول کرۂ ارض کے ہر گوشے میں صالح نظام زندگی کا پیغام پہنچاتے رہے۔ اُن سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا انسانی ذہن پر منحصر تھا۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں شمالی ہند میں سرسید احمد خاں کی قیادت میں ایک سماجی انقلاب برپا ہوا جس کا مقصد مسلمانوں کی زبوں حالی کو دور کرنا، اُن کے مسائل کا حل تلاش کرنا اور انھیں تعلیمی میدان میں دیگر برادرانِ وطن کے ہم پلہ کرنا تھا۔ وہ ایک حد تک اپنے اِس مقصد میں کامیاب رہے۔ اِن کی انقلابی مہم علی گڑھ تحریک سے موسوم ہے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ علی گڑھ

سے جو چراغ جلے اُس کی روشنی ملک کے چپے چپے میں
پھیلے۔ یہ اُسی وقت ممکن تھا جب کہ اُن کے ہم خیال ہر جگہ
اُن کے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں حد درجہ
کوشش کریں۔ اِس تحریک کا عین منشا مسلمانوں کو جدید
مغربی تعلیم سے روشناس کرانا تھا۔ ان کی سماجی حالت
کو بہتر بنانا تھا۔ اِن میں جو بے جا رسومات، اسرافات
اور خرافات سرایت کر گئی تھیں اُن کا ازالہ کرنا تھا۔ اُن
کے احساس کمتری کو دور کرنا تھا، ملک کے انتظامیہ میں
اپنا جائز حق دلوانا تھا۔ ان کی بے علمی، غربت، نکبت و
جہالت کو دور کرنا تھا۔ غرض علی گڑھ تحریک سے مسلمانوں
میں کچھ تو بیداری پیدا کرنا مقصود تھا۔ مسرت کا مقام کہ
ملک کا ہر حصّہ حتّٰی کہ جنوب کا ایک خطہ ملناڈ بھی اِس کے
زیر اثر آ کر رہا۔

پچھلی ریاست میسور کے ایک حصّہ کو جسے ہم ملناڈ کہتے
ہیں، جنت کا ایک گوشہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں کے
ہرے بھرے باغات، لہلہاتے کھیت، گھنے جنگلات، تیز رو
ندی نالے، اونچی اونچی پہاڑیاں ایسا دلفریب و خوشنما منظر

پیش کرتے ہیں کہ فردوس بریں کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہاں کی آب وہوا خوشگوار، یہاں کا جائے وقوع پسندیدہ، یہاں کی زمین زرخیز، یہاں کی پیداوار مفید اور سب سے بڑھ کر یہاں کے لوگ بڑے خلیق ہیں۔ یہاں بڑے بڑے شہر نہیں، آبادی گنجان نہیں، کاروبار کی گہما گہمی نہیں، زندگی کے دھارے میں تناؤ نہیں، اسی لیے ہر جگہ ایک گونہ سکون واطمینان کا شائبہ ہے اور یہاں کی فضا فرحت بخش محسوس ہوتی ہے۔ کافی، الائچی، سپیاری، کالی مرچ وناریل وغیرہ کے باغات کی وجہ قدرت اپنی فیاضی کا مظہر یوں پیش کرتی ہے کہ گویا یہاں سدا بہار ہے اور خزاں کا نام نہیں۔ اس خطّہ میں پچھلی صدی میں جب کہ سرسید کی تحریک شباب پر تھی، ایک ایسی ہستی وجود میں آئی جس کے دم قدم سے ملناڈ کے مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، اور اُن کا نام نامی محمد حسین ہے۔

محمد حسین ضلع ہاسن کے ایک چھوٹے سے گاؤں "ایہلی" کے ایک معزز خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ آبائی پیشہ کافی کی کاشت تھا۔ نواب حیدر علی خاں بہادر اور حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کے زمانے میں مختلف مقامات سے ہر کسب وفن کے

لوگوں کو سلطنت خداداد میں بسایا گیا اور اُن کی ہمّت افزائی کی گئی۔ بیجاپور جو عادل شاہی خاندان کا دارالخلافہ تھا ہر فن و کاریگری کے لیے مشہور ہو چکا تھا۔ سلطان شہیدؒ نے جو ملک کے معاشی، صنعتی، زراعی و تجارتی شعبوں میں ایک انقلاب عظیم برپا کرنا چاہتے تھے، بیجاپور اور اُس کے مضافات سے، جہاں دیگر فن و کاریگری کے ماہروں کو دعوت دی ان میں جُلاہے بھی شامل تھے۔ اُن میں ایک قبیلہ پٹوے گر کہلاتا تھا جن کا کسب فوج کی وردی کا سامان تیار کرنا تھا۔ سلطان کی شہادت کے بعد مسلمان کاریگروں کے لیے فضا ہی بدل گئی۔ ناساز حالات سے تنگ آ کر وہ ریاست کے مختلف حصّوں میں بکھر گئے۔ انیسویں صدی کے وسط میں کافی کاشت کا آغاز بڑی شد و مد سے ہوا تو مسلمانوں کے لیے ایک نیا ذریعہ معاش نکل آیا۔ یہ پٹوے گر ہاسن اور چکمگلور اضلاع کے قریوں میں پھیل گئے اور کافی کی کاشت میں لگ گئے۔ یہ سب ایک برادری کے لوگ تھے۔ نرم مزاج، کم سخن، پاک دل و پاک باز تھے۔ اِن کی دکھنی یا اُردو سے علاحدہ اپنی ایک بولی تھی جس میں مراٹھی الفاظ بھرے ہوئے تھے۔ صاحب موصوف کا تعلق اسی کافی پلانٹروں کے خاندان سے ہے۔

انھوں نے اپنی آبائی جائیداد میں کافی توسیع کی۔ اپنی محنت، کوشش، ہمت و حوصلہ، عزم و استقلال سے اور مالک دوجہاں کی کرم و عنایت سے اتنے کافی کے باغوں کے مالک بن گئے کہ ان کا کوئی ثانی نہ رہا اور اُن کی شان اتنی بڑھی کہ ساہوکار محمد حسین کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ یہاں ان کی دولت و ثروت کا نہیں بلکہ ملّی کارناموں کا ذکر مقصود ہے۔ انھیں ملناڈ کا سرسیّد کہنا غلط نہ ہوگا۔ سرسید نے کُل ہند کے سطح پر جو سماجی، اقتصادی، تہذیبی و تعلیمی کام کا اجرا کیا تھا وہی کام ساہوکار صاحب نے ملناڈ کے احاطہ میں کیا۔ سرسید کے دل میں ملت کی بہبودی کا جو جذبہ موجزن تھا، اُسی کا عکس ساہوکار صاحب کے دل میں بھی موجود تھا۔ جس تہذیب، جانفشانی و استقلال سے سرسید نے قوم کی رہبری بالا سطح پر کی، اُسی کا ایک ہلکا سا نمونہ محدود ملناڈ کے دائرے میں بھی ظہور پذیر ہوا۔ جس قسم کی ایثار و قربانی و دردانسانی کا شعلہ سرسید کے سینہ میں بھڑک اٹھا تھا۔ اُسی کی ایک چنگاری ساہوکار صاحب کے سینہ میں بھی موجود تھی۔ دونوں کا موازنہ اِس حد تک صحیح ہے کہ نور کی صفت

چاہے خورشید ہو چاہے جگنو ہو ایک ہی ہے ؎
جز مرتبۂ کُل حاصل کرے ہے آخر
ایک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

یہاں ایک بات یہ یاد رہے کہ عظیم ہستیاں اللہ کی دین ہوتی ہیں، جو مدتوں بعد خالق اپنے رحم و کرم سے انھیں انسانوں کو اس لیے بخشتا ہے تاکہ مالک کی دی ہوئی نعمتوں کے صحیح صحیح استعمال کا طریقہ لوگوں کو سمجھائیں۔ یہ نعمت عظمٰی ذہن انسانی ہے جس سے عقل و شعور کا جذبہ ابھرتا ہے، علم و عمل کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ اسی عقل و شعور کے صحیح استعمال کی طرف ساہوکار صاحب نے ہماری توجہ مبذول فرمائی۔ اُن پر مالک کی اَن گنت فیاضیاں تھیں۔ اُن کی گھٹی میں شرافت گھول دی گئی تھی۔ اُن کے ضمیر میں انسانیت رَس بس گئی تھی۔ فراست، نفاست و شجاعت ان کا شعار تھا ورنہ وہ سینکڑوں ایکڑ اراضی کے مالک نہ بنتے۔ ان کے سوچنے، سمجھنے اور بولنے کا انداز نرالا تھا۔ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا ان کا طریقہ انوکھا تھا۔ خدا نے انھیں دینوی مال و دولت سے ہی نہیں بلکہ دل و دماغ کی بلندی سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ دریا دلی و فیاضی میں مشہور

تھے۔ دور اندیشی میں یکتا تھے۔ اخلاقی شخصیت کا ایک مجسمہ تھے۔ اُن کے بے شمار اعلا صفات میں صرف ایک دو کا ذکر یہاں مقصود ہے۔

سرسید نے علی گڑھ تحریک سے جو روح مسلمانانِ ہند میں پھونکی تھی، اسی کا ایک نمونہ ساہوکار صاحب کی وجہ ملناڈ میں بھی نظر آنے لگا۔ اُن کے ذہن میں یہ بات آئی کہ تعلیم کے بغیر مسلمان سرخرو نہیں ہو سکتے، مغرب اِس معاملہ میں بہت آگے ہے۔ سائنس اور تکنالوجی میں سبقت کی وجہ سے یوروپی اقوام ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہیں، جب تک مسلمان بھی اِس میدان میں آگے نہ آویں، اُن کی حالت سدھر نہیں سکتی۔ ہمارے برادرانِ وطن یوروپی علوم کو اپنا کر ترقی کی منزل پر گامزن ہیں۔ وہ انگریزی سیکھ کر سرکار، دربار، صنعت و حرفت، تجارت و علوم و فنون، ہر جگہ سرخروئی حاصل کر رہے ہیں اور مسلمان ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ دوسرے ہم قوم مگر غیر مذہب والے مزدوری کر کے اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ مگر مسلمان اِس معاملہ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

ملناڈ کے بچوں کے لیے ایک اور مشکل تھی۔ چونکہ وہ

قریوں اور باغات میں بستے تھے، اس لیے ذہین بچے بھی، اعلا تعلیم سے محروم رہ جاتے تھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہروں میں رہائش گاہوں کی ضرورت تھی۔ ساہوکار صاحب کا یہ بڑا احسان تھا کہ انھوں نے اس ضرورت کو صرف محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اس کا حل بھی تلاش کیا اور وہ بھی اس طرح کہ جلد سے جلد یہ کمی دور ہو جائے۔ انھوں نے خود اپنے بنگلے خالی کروا کر ہوسٹلوں میں تبدیل کر دیا۔ فیاض لوگ یا تو پیسہ دے دیتے ہیں یا ایسی ہی خالی زمین جو فالتو ہو سکول یا ہوسٹل کی تعمیر کے لیے دے دیتے ہیں۔ یہاں معاملہ دیگر تھا۔ خود اپنی رہائش کے بنگلے خالی کر کے ہوسٹلوں میں تبدیل کرنا کہیں دیکھا نہیں گیا تھا، ایک نہیں ملناڈ کے دو بڑے شہروں میں، ہاسن اور چکمگلور میں اپنے بڑے بڑے بنگلے مسلم طلبا کی رہائش کے لیے انھوں نے وقف کر دیے۔ یہ نہایت ہی مبارک قدم تھا جس کی اہمیت کا اندازہ بعد میں ہوا۔ ہاسن کا بنگلہ جس اراضی پر واقع تھا وہ اتنی بڑی تھی کہ آج وہاں صرف ہوسٹل ہی نئے سرے سے تعمیر نہیں ہوا ہے بلکہ غریب طلباء کی امداد کے لیے آمدنی کا

ذریعہ بھی بن گیا ہے۔ فیاضی وسخاوت کا یہ نادر نمونہ تھا۔
صرف ہاسن اور چکمگلور میں ہی نہیں بلکہ میسور اور بنگلور میں بھی اسی غرض سے کہ دور دراز سے آئے ہوئے طالب علموں کو تکلیف نہ ہو، انھوں نے رہائش گاہ کا انتظام کیا۔ میسور میں سر مرزا اسمٰعیل صاحب کی عنایت سے ایک نہایت ہی عمدہ مقام پر وسیع خطۂ آراضی فراہم ہوگئی تھی۔ لیکن اُس زمانے کی مالی مشکلات کے مدنظر کسی میں یہ سکت نہ تھی کہ وہاں ایک پختہ عمارت ہوسٹل کے لیے بنوا دی جائے۔ میسور اعلا تعلیم کا مرکز ہے۔ ساری ریاست میں اس وقت میڈیکل اور بی۔ اے اور ایم۔ اے کی تعلیم کے لیے واحد مقام تھا۔ ہمارے طلبا کے لیے رہائش گاہ نہ ہونے کی وجہ ساری ریاست سے آنے والے طلبا اعلا تعلیم سے محروم ہو رہے تھے۔ اس لیے ساہوکار صاحب اور ایک فیاض ہستی، حاجی سر اسمٰعیل سیٹھ، دونوں کے تعاون سے میسور شہر میں اس وسیع اراضی پر ہوسٹل کے سات بلاک تعمیر کیے گئے۔ کُل ریاست میسور کے جتنے بھی مسلم گریجویٹ اِس یونیورسٹی سے نکلے اُن میں سے کافی تعداد

اسی ہوسٹل والوں کی ہے۔

صرف ہاسن چکمگلور اور میسور میں ہی نہیں بلکہ بنگلور جیسے بڑے شہر پر بھی ساہوکار صاحب کا احسانِ عظیم رہا ہے۔ بنگلور کے سنٹرل مسلم ایسوایشن کی جانب سے جو تحریک نواب غلام احمد کلامی صاحب اور عباس خاں صاحب کی طرف سے شروع کی گئی، اُس کی حمایت بھی ساہوکار صاحب نے کی اور اس کی ترویج کے لیے کافی رقم عطا فرمائی۔ ملناڈ کا کوئی غریب تعلیم یافتہ ایسا نہ تھا جس نے اُن سے فیض حاصل نہ کیا ہو۔ ملناڈ کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں ان کا تعلیمی پیغام پہنچا نہ ہو۔ وہ تاڑ گئے تھے کہ ہم تعلیم و تربیت کے ذریعے ہی عزت کی زندگی بسر کریں گے۔ تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات ملناڈ کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

تعلیم و تربیت کا صرف ایک ہی شعبہ نہیں جس میں انھوں نے نمایاں کام کر دکھایا۔ ملت کی اخلاقی، معاشی، سماجی و ثقافتی اصلاح میں بھی اُنھوں نے کافی حصّہ لیا۔ شادی بیاہ کے موقع پر ایسے رسومات واسرافات رائج

ہو چکے تھے جو بربادیوں کے نشانات تھے۔ ایک نہیں
تین تین دن کی شادی، باجے گاجے، گھوڑوں پر بارات،
دعوتیں، ضیافتیں، گانا بجانا، سب کچھ ہمارے معاشرے
میں داخل ہو چکا تھا۔ اسلامی سادگی جو رسول اکرمؐ کا
ارشاد تھا قصہ پارینہ بن کر رہ گئی تھی۔ ان اسرافات و
خرافات سے گھر کے گھر تباہ ہو جاتے تھے۔ قرض کے
پھندے سے نجات نہ پا سکتے تھے۔ رہی سہی زمین یا جائیداد
یا مکان فروخت کر کے سماجی رسوم کی اتباع پر مجبور ہو جاتے
تھے۔ ساہو کار صاحب کے طفیل ایسا انقلاب آیا کہ یہ
ساری کمزوریاں دور ہو گئیں۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔
برسوں سے چلے آئے رسم و رواج قلیل مدت میں ختم
نہیں ہو سکتے۔ جس جانفشانی و حکمت عملی سے وہ اِس
میدان میں تبدیلی لائے وہ قابل صد تحسین ہے۔ انھوں
نے اصرار کیا کہ صرف ایک دن کی شادی ہو۔ ہو سکے تو
وہ مسجد میں ہو، باجہ نہ ہو، بارات نہ ہو، بے جا
رسومات و خرافات نہ ہوں ہر چیز سادگی سے ہو۔ دوسروں
کو کہنا آسان ہے، خود کرنا مشکل۔ اِس لیے اس سادگی کا

کا آغاز انھوں نے خود اپنے گھر سے کیا۔ اپنے فرزند اور اپنے
بھائی کے فرزند کی شادی اِس طرح سے رچائی جو مثالی تھی۔
عہدِ زرین کی یاد تازہ کرتی تھی، شان بڑھانے کے لیے مہر
کی رقم خوب بڑھا دی جاتی تھی۔ انھوں نے حد مقرر کی اور
کہا کہ یہ رقم ایک صد سے بھی کم ہو۔ تاکہ اس کی ادائیگی میں
تکلیف نہ ہو۔

اصلاح کے لیے انھوں نے ایک اور تجویز سوچی۔
ہر شادی میں ان کی شرکت ضروری تھی۔ ان کی ہمدردی، برتری،
خلوص و نیک نیتی کا ایسا اثر پڑا کہ وہ ملناڈ کے لیڈر بن گئے۔
ہر شخص کے دل میں ان کے لیے عزت و احترام کا جذبہ موجزن
تھا۔ اس لیے ہر نکاح میں ان کی موجودگی ضروری سمجھی گئی۔
بہن آئے نہ آئے، بھائی آئے نہ آئے۔ رشتہ دار آئیں نہ آئیں
اُن کا آنا ضروری تھا اور وہ اس وقت تک نہ آتے جب تک
کہ ان کی سب شرطیں قبول نہ کر لی جائے۔ چند ہی سال
میں اُن کے طفیل بے جا اسرافات کا قلعہ قمع کر دیا گیا۔ ملناڈ
میں ہر جگہ سادگی سے ہوتے ہوئے سیدھی سادھی شادیوں
کا رواج پڑ گیا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ملناڈ پھر

یہ سبق بھول گیا ہے ۔ اوروں کی دیکھا دیکھی پھر اسرافات وخرافات پر اتر آیا ہے ۔ خون پسینہ سے کمائی ہوئی دولت کو دو چار دن میں پانی کی طرح بہا دیا جاتا ہے ، نیک ومفید کاموں پر بخل اور بے جا رسومات پر فیاضی سے کام لیا جاتا ہے ۔ بہتر ہو کہ خود سا ہو کار صاحب کے خویش واقارب ایک بار پھر ان کے نقش قدم پر چلنے کے عادی ہو جائیں ۔

صرف شادی بیاہ کے اسرافات کی اصلاح نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے کی کوشش انھوں نے کی ۔ ملناڈ کا کوئی گھر کہیں بھی ایسا تعمیر نہ ہوتا جس کی کھڑکی کہاں لگے ، کتنے دروازے ہوں ، کیسی چھت ہو وغیرہ جیسی تفصیلات اُن سے حاصل نہ کی گئی ہوں ، ملناڈ کی کوئی ایسی مسجد نہ تھی جس کی تعمیر میں اُن کا حصہ نہ رہا ہو ۔ اُن کی فورڈ موٹار کا ایک چھوٹا جہاز ہوتا تھا جس میں مسافر لدے چلے جاتے تھے ۔ اُن کا دسترخوان کھلی عام دعوت ہوتا تھا ۔ غریبوں کے لیے اچھی غذا کا انھیں اس قدر خیال تھا کہ خود بیف نوش فرماتے تاکہ دیگر لوگ بھی اِن کا دیکھا دیکھی اس حلال چیز کو حقارت سے نہ دیکھیں

اور کم از کم غریبوں کو ایک مقوی غذا سے محروم نہ رکھیں۔
غرض ان کے اصلاح کا پروگرام کافی وسیع تھا۔ خدمت
خلق اُن کا شعار بن چکا تھا۔

آخر میں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ہم اُن سے کیا سبق
سیکھ سکتے ہیں؟ پہلا یہ کہ انسان کی تخلیق کا مدعا ایک
صالح و برادرانہ نظام حیات کا قیام ہے اور وہ اس وقت
تک پورا نہ ہوگا۔ جب تک کہ اسلامی سادگی، اخوت و
مساوات کے مفہوم کو ہم اچھی طرح سمجھ نہ جائیں۔ اُن
کے ذہن میں یہ بات پختہ ہو چکی تھی۔ دوسرا یہ کہ ذہن
انسانی سے عظیم تر شئے کائنات میں کوئی نہیں۔ اس کے
صحیح استعمال سے انسان خلیفۃ الارض بن سکتا ہے۔
اس ذہن کی آب و تاب تعلیم و تربیت سے ہے اور علم و
ہنر کے جوہر کو عام کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے، ساہوکار
صاحب اس عمل میں تا عمر مشغول رہے۔ تیسرا یہ کہ انسان
اپنے عقل و شعور، صلاحیت و قابلیت و مال و دولت کا
صحیح استعمال کرے۔ وہ اپنی فراست و ذہانت اور محنت
سے سیکڑوں ایکڑ کافی کے باغات کے مالک بنے اپنی

صلاحیت و قابلیت سے ایک مقبول رہنما و رہبر بن گئے۔
اور اپنے مال و دولت کو خلق خدا کی بہبودی میں لگا کر مقبولیت
کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ چوتھا یہ کہ خدا جب دینی و دنیوی نعمتوں
سے نوازے تو انسان سادگی و انکساری اختیار کرے۔
غرور و تکبر سے احتراز کرے، دوسروں کا خیال رکھے، اُن
کے دُکھ سُکھ میں کام آئے اور ہمدردی و انسانیت کا
مظاہرہ کرے۔ یہ سب اوصاف آن میں کوٹ کوٹ کر
بھرے ہوتے تھے۔ پانچواں یہ کہ انسان اپنی دولت کو
اللہ کی امانت سمجھے، اسرافات سے بچے، اپنی ضروریات
سے جو کچھ بچ رہے اس میں دوسروں کو بھی شریک کرے۔
خویش و اقارب، یتیم و یسیر، غریب و غربا، محتاج و مساکین
کا خاص خیال رکھے۔ وہ اِس معاملہ میں سب سے
پیش پیش رہے۔ چھٹا اور آخری یہ کہ صالح زندگی وہ ہے
جہاں انسان حقوق اللہ و حقوق العباد کے معنے سمجھے۔
حقوق اللہ صرف پنج گانہ صلوٰۃ و صوم و طواف و حج ہی کو نہیں
کہتے بلکہ وہ صلوٰۃ الدائمون ہے جہاں بندہ ہر وقت
اور ہر رنگ میں مالک کی رضامندی سے جُڑ جاتا ہے

اور اس کی ہر سانس میں خوشنودئ خداوندی کا خیال
رکھتا ہے۔ اس کا سینہ ضمیر پاک سے بھرا ہوا ہوتا،
ہے اور اس کا خیال نیکی و بھلائی کی طرف راغب رہتا
ہے۔ یہ سب باتیں ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔
بصدق دل دعا ہے کہ مالک ان کی لحد کو نور سے بھر دے
اور ہم سب کو اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا
فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ہو حسن طلب لاکھ، مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدق طلب، پھر اثر آہ رسا دیکھ

اسلامی عہد اولیٰ میں خواتین کا مقام

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلم خواتین کا جو مقام قرون اولیٰ میں تھا، وہ آج نہیں ہے۔ مزید تعجب یہ کہ دین برحق نے قلیل مدت میں اُن کی حالت اس قدر بدلی کہ جو لوگ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تھے، وہ یہ سمجھنے لگے کہ جنّت ماں کے قدموں کے نیچے ہے، بیوی رفیقۂ حیات ہے، بیٹی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، عورت گھر کی ملکہ ہے۔ زندگی کے باغ و بہار ہیں، برابر کی حصّہ دار ہے، حتیٰ کہ جنگ کے میدان میں بھی وہ موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ کائنات کے حسن و جمال کا ایک نادر نمونہ اور تخلیق کے اعجاز کا ایک شاہکار سمجھی جانے لگی۔ مسرت و انبساط کا سرچشمہ اور علم و ادب و عشق و رقت کا سامان بن گئی، تاریخ گواہ ہے کہ اُس زمانے

میں جس کو کہ ہم عہد تاریکی کہتے ہیں کسی مذہب نے عورتوں کو وہ درجہ نہیں بخشا جو اسلام نے انھیں عطا کیا۔ لیکن آج جب کہ علم وہنر کی روشنی مہرتاباں کی طرح ہر جگہ جگمگا رہی ہے، مسلم خواتین چار دیواری کے اندر محصور ہیں۔ وہ زندگی کے ہر دوڑ میں پیچھے ہیں، حالانکہ تعداد میں مردوں سے بھی زیادہ ہیں۔ مگر سیاسی ہو یا سماجی، تعلیمی ہو یا تہذیبی، معاشی ہو یا ثقافتی، انتظامی ہو یا کاروباری، صنعتی ہو یا حرفتی، ہر میدان میں وہ دوسروں کے مقابلے میں حد درجہ پیچھے رہ گئی ہیں۔ یہاں یہ بحث نہیں کی جارہی ہے کہ ایسا کیوں، بلکہ تاریخ کے صرف اُن واقعات کی نشاندہی کی جارہی ہے جن سے شاید ہمیں کچھ روشنی ملے۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی بیٹی بی بی اسماء علم کے موتی رولتی تھیں، لخت جگر خاتونِ جنت فاطمۃالزہراؓ مذہبی امور کے دقیق نکتوں پر اپنے باپ سے بحث کرتی تھیں۔ اُمّ سلمیٰ نے صرف جنگ احد میں ہی نہیں بلکہ جنگ حنین میں بھی حصہ لیا۔ ایسی حالت میں جب کہ وہ حمل سے تھیں۔ حضرت حمزہؓ کی بہن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی صفیہ، جنگ

احد میں شریک تھیں، انھوں نے غزوۂ خندق میں ایک قلعہ کو دشمنوں کے ہاتھ سے بچایا۔ غزوہ قدسیہ میں خنسہ جو شاعرہ بھی تھیں۔ اپنے چار فرزندوں کے ساتھ میدانِ کارزار میں شریک تھیں۔ اُمّ عامرہ ایک نہیں چھ جنگوں میں (جنگ احد، حدیبیہ، خیبر، عمر طلقتہ، حنین ویمامہ) شریک تھیں۔ شام کی جنگ میں اُمّ حاکم اپنے شوہر کے شانہ بہ شانہ شامل تھیں۔ بی بی عائشہؓ کا سیاست میں کافی دخل تھا۔ بی بی زینب جنگ کربلا میں شامل تھیں۔ غرض رزم وپیکار جو مردوں کا خاص اکھاڑہ سمجھا جاتا ہے، وہاں بھی مسلم خواتین نے شجاعت و بہادری کی مثالیں قایم کیں۔

علوم وفنون میں بھی وہ پیچھے نہیں تھیں حدیث، فقہ و ادب کے شعبوں میں بھی اُن کا ہاتھ تھا۔ صحیح مسلم وبخاری میں سینکڑوں احادیث حضرت بی بی عائشہؓ سے منسلک ہیں۔ امّ سلمیٰ، امّ عالیہ، امّ ہانی اور کئی دیگر خواتین کی روایتوں سے بھی احادیث کا ذخیرہ اکٹھا کیا گیا ہے۔ شاعری کے میدان میں بھی یہ آگے تھیں۔ خنسہ، صفیہ، عتیقہ، ہند بنت حارث، کبشہ بنت رفیع وغیرہ اپنے دور کی مشہور شاعرہ تھیں۔ اُس

زمانے کے خواتین کسب و فن میں بھی کمال رکھتی تھیں۔ حضرت بی بی خدیجہؓ کا تجارتی کاروبار کافی وسیع تھا۔ اسماء بنت مکرمہ عطر سازی کا کاروبار کرتی تھیں۔ کئی ماہر و قابل طبیب تھیں جیسے رفیدہ، اسلمہ، اُمِ مولٰی، اُمِ کبش وغیرہ۔

انتظامی امور میں بھی پیچھے نہ تھیں۔ حضرت فاطمہؓ کا عبور مذہبی مسائل تک ہی نہیں بلکہ خلافت کے پیچیدگیوں کو حل کرنے تک بڑھا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایک خاتون کو تجارتی منڈی کی نگہبانی کا کام سپرد کیا تھا۔ عہد عباسیہ میں شہزادیوں کا سیاست میں کافی دخل رہا۔ خلیفہ ہارون الرشید کی والدہ، بہن، بیوی، سب امورِ مملکت میں دخل رکھتی تھیں۔ خلیفہ مقتدر کی والدہ عدالت عالیہ کی صدر تھیں۔ خلیفہ منصور کے عہد میں محل کی دو شہزادیاں بھیس بدل کر جنگ میں شریک ہوئیں۔ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ اُس دور کی مشہور شاعرہ تھیں۔ خلیفہ ولید اول کی ملکہ، اُمّ البنین بڑی عالم و فاضل سمجھی جاتی تھیں۔ حضرت امام حسینؓ کی صاحبزادی بی بی سکینہ بھی علم و فضل میں یکتا تھیں۔ حضرت رابعہ بصری کا شمار صوفیائے کرام

کے (صف اول) میں ہوتا ہے۔ پانچویں صدی ہجری میں ایک معزز خاتون شیخو شہدا کو فخر النسار کا خطاب عطا کیا گیا تھا، بغداد کے مشہور علمار میں اُن کا شمار کیا جاتا تھا۔ مصر کے فاطمی خلافت کے زمانے میں یمن کی گورنر حرّہ ملکہ عروہ تھیں۔ ہمارے ملک میں بھی سلطانہ رضیہ چاند بی بی، نورجہاں وغیرہ نے حکومت کی ہے۔ ظہیر الدین بابر کی بیٹی گلبدن بیگم کا "ہمایوں نامہ" تاریخ کا مخزن ہے۔ اورنگ زیب کی صاحبزادی زیب النسار غضب کی شاعرہ تھیں۔

اگر اِس نقشہ کو آج کے حالات سے موازنہ کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ ہم پھر اُلٹے ایام جہالت کی طرف چلے جا رہے ہیں ؎

گلشن میں بہاروں کے شامل تھا لہو جن کا
وہ لوگ ہیں گلشن میں اب صرف تماشائی

ہمارے ہی دیش کی گنتی لیجیے کہ کتنی خواتین عالم، فاضل، مدبر، مفکر، سائنس دان، انجینئر، ڈاکٹر، وکیل یا اعلا عہدوں پر فائز ہیں۔ اِن شعبوں میں اُن کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ اِس کا تدارک کیا ہے؟

سب سے اہم تعلیم نسواں، تعلیم، صحیح تعلیم، دینی تعلیم، عصری تعلیم اور فنی تعلیم۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے ہمارے دیش کے تقریباً آدھے باشی بے علم ہیں اور اُس جماعت کا کثیر حلقہ مسلم خواتین کا ہے۔ برہمن، عیسائی، پارسی، جین، بدھ، سکھ، لنگایت، حتیٰ کہ دِلت خواتین بھی تعلیم کے میدان میں ہم سے آگے ہیں، شرم کی بات یہ حال اُس قوم کا ہے جو ــ

چمکا کیے زمین پر تم آفتاب بن کر
ہر دم بلندیوں پر روشن رہا ستارہ

اِس لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ امت مسلمہ لاعلمی کے کینسر کو دور کریں۔ اُس کا علاج غفلت شعاری سے احتراز، اپنی پستی کا احساس، حالات حاضرہ سے آگہی۔ اپنی اصلاح کے لیے جدوجہد اور تعلیم نسواں سے دلچسپی ہے۔ اپنی بچیوں کی تعلیم کو زیست کا حاصل سمجھیں، اُن کی تربیت کو عبادت کا درجہ دیں اور اُن کے مستقبل کو سنوارنے میں اپنا خون پسینہ ایک کردیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اِس شعور و آگہی کو عام

کرنے میں ملت کا ہر فرد حصہ لے۔ خاص کر وہ طبقہ جو فیضانِ سماوی سے مستفیض ہے۔ ہمارا مالدار طبقہ، ہمارا علم و ہنر کا طبقہ، ہمارا عقل و دانش کا طبقہ، ہمارے سیاسی رہنماؤں کا طبقہ، ہمارے مذہبی پیشواؤں کا طبقہ، ہمارے وکیلوں، ججوں اور افسروں کا طبقہ، اور ہمارے تجارتی، زراعتی، صنعتی و حرفتی بھائیوں کا طبقہ، غرض ہر فرد یہ خیال رکھے کہ اُن کی عاقبت کا توشہ یہی ہے کہ کسی ایک غریب بچی کی تعلیم کو اپنی بچی کی تعلیم کے برابر سمجھے اور اُس کو زندگی کے فرائض کا ایک لازمی حصّہ تصوّر کرے۔ ہمارے سسکتے بلکتے غریب بھائیوں کی کثیر اولاد اس حالت میں نہیں کہ وہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں۔ اخوت و مروت کا گاتا گانے والے کیا ایک بچّی کی تعلیم کی ذمہ داری نہیں لے سکتے؟ لاکھوں کا سرمایہ اپنی دختر کی شادی میں صَرف کرنے والے، اپنے ہی ملت کی ایک اور کلی کو مرجھانے سے نہیں بچا سکتے؟ عبادت و ریاضت و تسبیح و طواف کا خطبہ دینے والے، کیا ایک کلمہ گو بچی کو لائق نہیں بنا سکتے؟ اللہ کا شکر ہے کہ اب اس کی ابتدا ہوئی ہے لیکن ایک انار صد بیمار کا حال نہ ہونا چاہیئے۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ ہمیں بے شمار اپنے ہی اسکول چاہیئے دیگر سکولوں میں ہمارے بچیوں کی صحیح تعلیم و تربیت نہیں ہو رہی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ حکومت ہند اقلیتی طبقوں کی خواتین کی تعلیم کا خاص منصوبہ بنا چکی ہے۔ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ جب تک ہر محلہ کی ہر گلی میں ہمارے سکول و مدرسہ نہ ہو، ہم سدھر نہیں سکتے۔ تیرہ چودہ کروڑ کی آبادی کے لحاظ سے ہمارے موجودہ سکول بہت ہی کم تعداد میں ہیں۔ اگر یہی حال اور چند سال باقی رہے تو سارے عالم کی لاعلمی ہماری بہنوں کے حصّہ میں آجائے گی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ پرائمری و سیکنڈری تعلیم کا بوجھ صرف سرکار پر نہ چھوڑیں۔ اُس کی فراہم کی ہوئی سہولتوں کے ساتھ ساتھ اپنا سرمایہ اور قوت بھی کام میں لائیں۔ ہر ذی فہم، صاحب حیثیت و صاحب اقتدار اپنا طرّۂ امتیاز یہ تصوّر کرے کہ اُس نے کم از کم ایک ــــ دو سکولوں کی ابتدا کی ہے۔ ہمارے ہی برادرانِ وطن پچھلے کئی سالوں سے یہ کام کرتے آرہے ہیں۔ صرف ملت مسلمہ کی بدقسمتی ہے کہ وہ خواب خرگوش میں پڑی ہے، اِس لیے شان و شوکت و دستار فضیلت کا معیار یہ ہو کہ وہ کتنے

سکولوں کا بانی ہے، اور نہ یہ کہ اُس کا محل سرا کیا ہے، اُس کا بینک بائیلنس کتنا ہے، اس کے کتنے نوکر چاکر ہیں اور اُس کی کتنی موٹر گاڑیاں ہیں؟

چوتھی اہم بات یہ ہے کہ ہر شخص قانون قدرت کو یاد رکھے جہاں تغیر بھی ہے اور استقلال بھی۔ (Change and Chagelessness)۔ کائنات کی ہر شئے میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ آفتاب ایک حالت میں نہیں رہتا۔ کبھی طلوع، کبھی غروب، کبھی نصف النہار، کبھی زوال، لیکن اس کے استقلال کا یہ عالم ہے کہ اس کی گرمی و روشنی میں کبھی فرق نہیں آیا، اور نہ وہ کبھی مغرب سے نکلا اور نہ مشرق میں ڈوبا، ہمیشہ وہ اپنی روش پر مستقل ہے۔ یہی حال دنیا کی ہر شئے میں ہے۔ آم کے بیج سے نیم کا درخت نہیں اُگے گا، مرغی کے انڈے سے بطخ نہیں نکلے گی ؎

برسے امرت بھی آسمان سے اگر
کھاؤ گے شاخ بید سے نہ ثمر

لیکن آم کا بیج آم کے درخت میں تبدیل ہوگا، انڈہ چوزے کا شکل اختیار کرے گا، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح انسان میں

تغیر آتا ہے، وہ بچہ سے جوان اور جوان سے بوڑھا بنے گا۔ مگر تخلیق کا مدعا ہے کہ وہ ہمیشہ انسان رہے۔ لیکن وہ کبھی کبھی حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ایک ہلاکو یا چنگیز یا قیصر یا کسریٰ یا ہٹلر، ہزاروں کیا لاکھوں کو عین جوانی میں موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے گو کہ اس کو اتنی بھی سکت نہیں کہ ایک مردہ چیونٹی میں جان بھر دے۔ یعنی انسان قدرت کے قانون کو توڑ رہا ہے۔ صحیفۂ پاک میں آیا ہے کہ تحصیل علم مَرد و عورت دونوں پر فرض ہے، لیکن مسلمان اس فرض میں کوتاہی برت رہے ہیں اور مالک کی نافرمانی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

پانچویں اور آخری اہم بات یہ ہے کہ ہماری توجہ اُن اسباب و علل پر ہونی چاہیئے۔ جہاں عقل برہانی و عقل روحانی دونوں کارفرما ہوں۔ عقل برہانی سے آج انسان کائنات کے عناصر پر حکومت کرنے لگا ہے اور مسلمان اس دَوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور ہماری خواتین تو مزید پیچھے۔ جب تک یہ توازن ٹھیک نہ ہو، بنی نوع انسان کا ایک حصّہ کمزور ہی رہے گا۔ جس کا اثر تمام عالم انسانیت پر پڑے گا۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہم خواتین کو زندگی کے شعبہ میں ہم پلّہ بنا دیں۔
ہماری زیست کے لیے صرف عقل برہانی ہی کافی نہیں، عقل روحانی بھی چاہیئے یہی تعلیمات اسلامی کا نچوڑ ہے اور اُسی لیے تعلیم، صحیح تعلیم، دینی تعلیم، عصری تعلیم وفنی تعلیم ضروری ہے جس میں دل، دماغ اور ہاتھ تینوں بہ یک وقت کام میں لگ جائیں گے۔ عقل روحانی اخلاقیات کا سرچشمہ ہے جو انسانِ کامل تک پہنچنے کا پہلا زینہ ہے۔ ہمارے قرونِ اولیٰ کے بزرگ اس راز کو جان گئے تھے۔ اُس صورت حال اور اس حقیقت کو دوبارہ اجاگر کرنا اور اس پر عمل کرنے کے لیے فضا سازگار کرنا ہے تاکہ ہم ایک تعلیم وتہذیب کے زیور سے آراستہ ہوں۔

اکیسویں صدی میں تکنالوجی واخلاقی اقدار کی ضرورت

بیسویں صدی کے اختتام کے لیے ابھی چار سال ہی تو باقی ہیں۔ ہر شخص مستقبل کی فکر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ آنے والے دنوں میں خوش حالی و فارغ البالی نصیب ہو، اطمینان وسکون میسر ہو، امن و امان کا دور دورہ ہو اور زندگی صحت و عافیت وخیر خوبی سے گزرے۔ یہاں ایک ہلکی سی جھلک اُن امور پر ڈالی جارہی ہے کہ اِس مقصد کے حصول کے لیے کن باتوں کی ضرورت ہے اور وہ کیسے حاصل کیے جاسکیں گے۔

سب سے پہلے یہ سوچ ضروری ہے کہ بیسویں صدی میں ہمارا کیا حال رہا۔ ماضی کو اچھی طرح سمجھے بغیر ہم نہ حال میں صحیح قدم اٹھا سکتے ہیں اور نہ مستقبل میں

کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اِس صدی میں ملت اسلامیہ کا بڑا ہی بُرا حال رہا۔ پہلی جنگ عظیم میں دولت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ اُس جنگ سے لے کر کویت کی جنگ تک ہر جگہ مسلمانوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ایک حقیر سی یہودیوں کی جماعت نے عربوں کی ایک کثیر خلقت کو مجبور ولاچار کیے رکھا۔ اُن کے مقدس مقامات پر بھی قبضہ جمائے رکھا۔ زندگی کے ہر میدان میں مسلمان پیچھے رہے۔ اُن کی تعلیمی، تہذیبی، اقتصادی، سماجی وسیاسی حالت ناگفتہ بہ رہی۔ سامراجی نظام نے اُنھیں ہر جگہ تنگ کیا۔ اُن کے ملکوں پر قبضہ جمایا، اُن کی آزادی چھینی، ان کی دولت کو لوٹا، ان کا خون چوسا، اور انھیں کنگال بنایا۔ دوسری طرف ملت اسلامیہ خود آپسی تفرقوں میں پھنس گئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے پھندارے انھیں ایسے راس آئے کہ خلافت کا عہدہ جو صدیوں سے قایم تھا خود اپنے ہاتھوں ختم کر دیا گیا۔ کہیں افغانستان کے اندر خانہ جنگیاں، کہیں

ایران وعراق کی جنگ، کہیں مصر وشام میں ناچاقیاں،
کہیں پاکستان وبنگلہ دیش میں رسہ کشی، یہاں تک کہ
حرمین وشریفین کے پاسبانوں میں بھی عیاری وخودغرضی
تیسری طرف مغربی تہذیب کا ایسا چسکہ کہ مسلمان اپنے
ماضی کو بھول گئے۔ اپنے اقدار سے بے اعتنائی کی۔ اپنا
رہن سہن، طور طریقہ، تعلیم تربیت یہاں تک کہ بول چال
پر بھی مغربی چھاپ رہی۔ اپنی زبان، اپنے روایات،
اپنی تہذیب وتمدن سے بیگانہ رہے۔ ستم یہ کہ عقیدوں میں
بھی فرق آیا۔ امت مسلمہ ان گنت فرقوں میں بٹ گئی۔ سائنس
کا غلبہ اس قدر بڑھا کہ مغربی تعلیم یافتہ اسلامی فرائض سے
بھی کوتاہی کرنے لگے۔

چوتھی اور سب سے اہم غلطی جو ملت اسلامیہ سے
سرزد ہوئی وہ علم وعمل وعقل وشعور سے غفلت تھی۔ ساری
دنیا بدل چکی تھی اور یہ جمود میں تھے۔ حالات حاضرہ سے
بیگانگی، حکومت واقتدار کے نشہ میں، انھوں نے وہ سبق
بھلا دیا تھا جس سے انھیں کے اسلاف بام عروج پر پہنچ
گئے تھے۔ وہ سبق علم وعمل کا تھا۔ اسلامی درسگاہوں

دانش گاہوں میں وہ خلش، وہ تپش، وہ سوز و ساز اور وہ جستجو نہ رہی جن کی وجہ اُنھیں کے اسلاف اتالیق عالم بن چکے تھے۔ جدت و ندرت و فکر ان کے ہاتھ سے چلی گئی تھی۔ ایجادات و اختراعات و انکشافات میں وہ پیچھے تھے۔ تفکر و تدبر یادگارِ ماضی بن چکا تھا۔ انقلابی روح پرواز کر چکی تھی۔ اُن کے سینوں میں علم کا دریا سمٹ کر گندہ تالاب بن گیا تھا۔ جہاں خیال بلند نہ ہو، ذوقِ لطیف نہ ہو، عمل پیہم نہ ہو اور احساسِ زیاں نہ ہو، وہاں انسان گرتے گرتے حیوان کی سطح پر آجائے گا۔

پانچواں المیہ جو مسلمانوں کے ساتھ ہوا وہ یہ کہ وہ خرافات میں پھنس گئے۔ اسرافات، رسومات و تقلیدات کا بھوت اُن کے سر ایسا چڑھا کہ شیطان کی جیت رہی۔ بے جا تصنع، تکلف و تواضع میں ایسے لگے کہ تخلیقی قوتوں کا صفایا ہوا، خودغرضی، خودپسندی، خودفریبی و آرام طلبی کے ایسے شائق بنے کہ ذلت ان پر لازم بن گئی۔ اسلامی سادگی و ہمدردی و تعلیمات و اخلاقیات سے ایسا مُنھ موڑا کہ رب کے عتاب کے مستحق بنے۔ دُکھ سے کہنا

پڑے گا۔

کیا جانئے کیا ہو گیا ارباب۔ جنوں کو
جینے کی ادا یاد، نہ مرنے کی ادا یاد

اس لیے اگر ملت اسلامیہ اپنی کھوئی ہوئی شان کو پھر سے حاصل کرنا چاہتی ہو تو مندرجہ بالا تمام کمزوریوں کو دور کرنا ہوگا۔ضرورت ارادہ کی ہے، نیک نیتی کی ہے، حوصلہ و ہمت کی ہے اور جوش کردار کی ہے۔ ان کمزوریوں کو دور کر کے خاموش بیٹھنا نہیں بلکہ کچھ اور بھی کرنا ہے وہ ہے ٹکنالوجی کو اخلاقیات میں ضم کرنا، ایسا جوڑنا ہے جیسے جسم میں جان۔ یہاں ٹکنالوجی و اخلاقیات کی توضیح کر دی جائے تو بہتر ہو۔علم کے جوہر کو اخذ کرنے کا نام ٹکنالوجی ہے، بات ذہن سے نکل کر عمل کے ذریعہ تخلیق میں نمودار ہو تو ٹکنالوجی بنتی ہے۔قدرت کی قوتوں کو جاننے کا نام سائنس ہے اور اُن قوتوں کی ظاہری تشکیل ٹکنالوجی ہے۔برقی توانائی کے حالات جاننا سائنس ہے، اس توانائی کو روشنی میں تبدیل کرنا، برقی قوت پیدا کرنا، مشینیں چلانا وغیرہ ٹکنالوجی ہے۔سائنس ابتدا ہے، ٹکنالوجی انتہا ہے۔سائنس وسیلہ ہے، ٹکنالوجی مقصد

ہے، سائنس علم ہے، تکنالوجی حکمت ہے۔ سائنس زر ہے اور تکنالوجی زیور۔ زر کے زیور میں تبدیل کے لیے ہنر چاہیئے، کسب چاہیئے، فن چاہیئے۔ قدرت کے اَن گنت خزانے کائنات میں بکھرے پڑے ہیں۔ اِن خزانوں کی جانچ پڑتال سائنس کا کام ہے اور اس جانچ پڑتال کو انسانی حیات کے لیے مفید اشیا میں تشکیل دینا تکنالوجی ہے۔ تکنالوجی کے بغیر سائنس بیکار ہے اور سائنس کے بغیر تکنالوجی ناممکن اسی لیے اِن دونوں کا رشتہ جسم و جان کا رشتہ ہے۔

یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ سب سے بڑا ماہر تکنالوجی کون ہے تو جواب آسان ہے۔ وہ کارساز حقیقی ہے۔ جس کی تکنالوجی کا اندازہ بشر سے ممکن نہیں۔ اِسی لیے کہا گیا ہے کہ سارے سمندروں کا پانی اگر دوات بنے اور سارے جنگلات کی لکڑی قلم بنے تو بھی مالک کی تکنالوجی کا تذکرہ ختم نہ ہوگا۔ مالک کے دربار میں گائے آج ہری گھاس چرتی ہے، کل سفید دودھ دیتی ہے، کیا یہ انسان سے ممکن ہے؟ ایک انڈہ تین ہفتوں کے اندر چوزہ بن کے نکلتا ہے، کیا انسان کسی کو یہ حیات بخش سکتا ہے؟ غذا پیٹ میں جاتی

ہے اور توانائی میں تبدیل ہوتی ہے، کیا انسان یہ کمال کرسکتا ہے؟ غرض کائنات میں ہر جگہ، ہر وقت اور ہر حال میں ٹکنالوجی جاری و سالم ہے۔ اب تک یہ سمجھ رہے تھے کہ سائنس پہلے اور ٹکنالوجی بعد میں۔ اب پتہ چلا کہ معاملہ دگر گوں ہے۔ پہلے ٹکنالوجی بعد میں سائنس۔ انسان کا دل ازل سے پمپ کا کام کرتا چلا آیا ہے لیکن اس کے صحیح حرکات کا علم حال ہی میں واضح ہوا ہے۔ غرض ٹکنالوجی قدرت کا وہ کارخانہ ہے جس سے کائنات کی کل چلتی ہے۔

پچھلے دو چار صدیوں سے ہی ٹکنالوجی کا شور و غل ہے اور اب ٹکنالوجی اپنے شباب پر ہے۔ چاند پر قدم رکھنا، ستاروں کے گزرگاہوں کو ناپنا، تنکے کو توڑ کر بجلی کی قوت پیدا کرنا، دل کے بجھتے چراغ کو پھر سے بھڑکانا، ہوا میں اڑنا، سمندر کی تہہ چاٹنا وغیرہ آج کل معمولی باتیں ہیں۔ یہ کرۂ ارض بازیچۂ اطفال بن گیا ہے۔ صبح کا ناشتہ نیویارک میں، دوپہر کا لنچ لندن میں اور رات کا ڈنر دہلی میں روزانہ کا معمول ہے۔ الکٹرانک اور کمپیوٹر سے آج کل ایسے کرشمے نمودار ہو رہے ہیں جو پہلے الف لیلہ میں تھے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اِس تکنالوجی سے انسانیت میں اضافہ ہوا یا نہیں، روحانی و نورانی مسرت حاصل ہوئی یا نہیں، انسان، انسانِ کامل بنا یا نہیں؟ دکھ سے کہنا ہوگا کہ نہیں۔ صرف آرام و آسائش میں اضافہ ہوا۔ معلومات میں اضافہ ہوا۔ ذہن کی آب و تاب میں اضافہ ہوا۔ لیکن روح کی تازگی میں کمی واقع ہوئی۔ اِس تکنالوجی کے طفیل ہٹلر کے بم سے لاکھوں کا خون ہوا۔ اِس تکنالوجی کے طفیل ہیروشما و ناگاساکی میں لمحوں میں قیامت برپا ہوئی۔ اِس تکنالوجی کے طفیل غریب ملکوں کی آزادی گئی۔ مہذب لبادہ میں درندوں کا راج رہا۔ اِس تکنالوجی کا طفیل کہ ایسے ہتھیار تیار ہوئے کہ یہ کرۂ ارض کیا، ایسے دس بیس کرۂ ارض بھی صفحۂ ہستی سے مٹائے جا سکتے ہیں۔ غرض تکنالوجی کا صحیح استعمال انسان کو فوق البشر کا شرف بخشے گا، اس کا غلط استعمال اس کو "اسفل السافلین" کی فہرست میں داخل کر دے گا۔ تکنالوجی سے انسان کہہ اُٹھے گا ؎

ایک کھیل ہے اورنگ سلیمان میرے نزدیک
ایک بات ہے اعجازِ مسیحا میرے آگے

اس کے ساتھ ہی انسانی لغزشوں کا یہ حال ہے کہ ؎

"امتیازِ گناہ مشکل تھا
احتیاطِ گناہ کیا کرتے؟"

اگر تکنالوجی کے یہ کرامات رہے تو اخلاقیات کی توضیح کیا ہے؟ اخلاقیات کا دوسرا نام تہذیب وتمدن ہے یہاں شرافت کے پھول نکھر آتے ہیں، انسانیت کا جوہر اُبھر آتا ہے۔ یہاں جمال وکمال کے کرشمے ظہور میں آتے ہیں۔ تخلیق کا بازار گرم ہوتا ہے، ادب، فلسفہ، فنون لطیفہ، دین، عکاسی، نقاشی مصوّری، معماری، موسیقی، غرض انسانی ذہن کے وہ مستحسن کمالات نمودار ہوتے ہیں جو انسانی جستجوئے آرزو کا مقصد ہوتے ہیں، قدرت کے راز فاش ہوتے ہیں اور خالق کے تخلیق کا آئینہ بنتے ہیں۔ اس تخلیق کے لیے کئی لوازمات چاہئیں۔ جن میں سے چند اہم یہ ہیں۔ حق و راستبازی، عشق وجمال، جلال و کمال، اور ایمانداری وانصاف۔ یہی وہ ستون ہے جن کے بل بوتے پر تہذیب وتمدّن واخلاقیات کے ایوان تعمیر پاتے ہیں۔

اخلاقیات کا پہلا زینہ حق ہے۔ حقیقت سے ہی

منسلک ہے۔ مالک حق سبحانہٗ ہے۔ حیات حق ہے۔
یعنی جھٹلائی نہیں جا سکتی۔ حق موجودات سے وابستہ ہے۔
وہم وگمان حق نہیں یعنی اُن کے وجود کا یقین نہیں۔ حق دانائی
ہے، جھوٹ کم عقلی ہے۔ حق سچّائی ہے، جھوٹ اس کی
ضد ہے۔ حق خیر ہے، جھوٹ شر ہے۔ حق کی تلاش
علم کا مدعا ہے، تمام ایجادات، اختراعات وانکشافات،
حق کی جستجو کے رہین منت ہیں۔ سائنس داں اپنے تجربہ گاہ
میں حق کی۔ یعنی حقیقت کی تلاش میں سرگرم عمل رہتا ہے۔
فلسفی اپنے تخیل میں گم ہو کر حق کے سراغ لگانے میں مصروف
رہتا ہے۔ اسی طرح ادیب، مصوّر، معمار، مغنی، مصلح سب
حق کے پرستار رہتے ہیں۔ انبیاؑ، اولیاؒ واصفیا بھی حق
کے متلاشی ہیں۔ ان کے کارناموں سے تہذیب کی محفل
فروغاں ہے۔ جہاں حق نہیں، تہذیب نہیں، تمدن نہیں،
اخلاقیات نہیں۔

عشق وجمال دوسرا اہم ستون ہے۔ انتہائی چاہت،
الفت، محبت وپیار کو عشق کہتے ہیں۔ کسی کے لیے مر مٹنے
کو عشق کہتے ہیں۔ عشق دل میں ایک آگ جیسی چبھن ہے۔

جب تک کسی شئے سے والہانہ الفت نہ ہو، انسان اُس شئے کی حقیقت کو نہیں جانتا۔ ہر شئے کے حصول کے لیے عشق چاہیئے۔ عشق زیست کا مدعا ہے، عشق دم جبرئیل ہے، عشق دل مصطفٰے ہے، عشق خدا کا کلام ہے، عشق خدا کا رسولؐ ہے۔ اس کائنات کا راز عشق میں مضمر ہے۔ عشق سے لگی ہوئی شئے جمال ہے۔ جمال کی وجہ عشق اُبل آتا ہے۔ جمال حُسن ہوتا ہے، اور عشق حسن کی پرستش کرتا ہے۔ حسن آئینہ حق ہے، دل آئینہ حسن ہے اور عشق، حق و حسن کا سنگم ہے۔ یہ ایک ہی مثلث کے تین لکیریں ہیں جن کے اندر تہذیب وتمدن کا چراغ روشن ہے۔

جلال وکمال تیسرا اہم رکن ہے۔ جلال نہ ہو تو ظہور نہ ہوگا۔ وجود میں آنا بھی تو کمال ہے۔ خیالات دماغ میں دہکتے ہوں گے مگر جب تک ان کا اظہار نہ ہو کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ مفید ہیں یا مُضر۔ قدرت کا ظہور جلال سے ہوا۔ مالک کے کُنْ فَیَکُوْن سے یہ کائنات وجود میں آئی۔ تخلیق کا راز جلال میں مضمر ہے۔ جلال صرف وجود کا ہی وسیلہ نہیں بلکہ اس کی نشوونما اور مقصد برآری کا بھی۔ ہم سب جلال کا طفیل

ہیں ۔ جیسے عشق کے ساتھ جمال لگا ہوا ہے، اسی طرح جلال کے ساتھ کمال لگا ہوا ہے ۔ قدرت کی ہر شئے میں کمال ہے، کیا پاکیزگی، کیا نفاست، کیا خوب صورتی اور کس قدر اعلا و ارفع، کہیں کوئی نقص نہیں، کہیں کوئی خامی، کوئی کمی نہیں ۔ حقیقت کا محل سرا عشق و جمال کی سکونت کے لیے جلال و کمال کے ذریعہ ہی وجود میں آیا ۔

اس محل سرا کا چوتھا ستون انصاف ہے، جلال و کمال کا میزان انصاف ہے، انصاف کہتے ہیں اُس مقام کو جہاں ضمیر و ذہن میں مطابقت ہو، عقل بھی مانے ضمیر بھی مانے ۔ انصاف کہتے ہیں اُس عمل کو جہاں حقدار اپنا حق پائے ۔ انصاف کہتے ہیں اُس صلح کو جہاں نفرت کی آگ ٹھنڈی ہو، انصاف کہتے ہیں اُس فیصلہ کو جہاں فریقین مطمئن ہو جائیں ۔ انصاف کہتے ہیں اُس جرأت کو جہاں بے خوف و خطر حقیقت کا اظہار ہو ۔ انصاف نہ ہو تو یہ دُنیا درندوں کی بستی بن جائے گی، لہٰذا اخلاقیات و انسانی زندگی میں انصاف کا درجہ اِس قدر بلند ہے جتنا کہ جسم میں ضمیر ۔

تکنالوجی واخلاقیات کی تشریح کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ اِن دونوں کا ملاپ کیوں ضروری ہے۔ اس لیے کہ ان کی دوری سے انسان خسارے میں رہے گا۔ بیسویں صدی میں جو ہنگامے برپا ہوئے۔ اِن دونوں میں ملاپ نہ رہنے کی وجہ ہی ہوئے۔ یہ دونوں الگ الگ خانوں میں بٹ گئے تھے۔ تکنالوجی میں انسانیت کا احساس نہ تھا اس لیے شرانگیزی وچنگیزی در زندگی واقع ہوئی۔ اخلاقیات کا سبق دینے والے تکنالوجی سے بے بہرہ تھے اور تکنالوجی والوں میں انسانیت مفقود تھی۔ اس لیے ۲۱ ویں صدی میں ملت اسلامیہ کے لیے یہ اہم ہے کہ وہ تکنالوجی میں آگے رہیں۔ صرف سائنس کافی نہیں، اس کی تبدیلی تخلیق کی صورت میں بہت ضروری ہے۔ اغیار اس میدان میں بہت آگے ہیں۔ اس چیلنج کو ہم نے اگر نہ قبولا تو زندگی کے دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ اور ہم پر یہ صادق آوے گا ؎

ہے ازل سے اِن غریبوں کے مقدر میں سجود
اُن کی فطرت کا تقاضیٰ ہے نماز بے قیام

دوسری طرف تکنالوجی کے ساتھ ساتھ اخلاقیات

بھی چاہیئے۔ جہاں عناصر پر حکومت کی طاقت آجائے وہاں حق و انصاف کا بھی بول بالا ہو۔ جہاں ذہن تیز رہے، وہاں دل بھی روشن رہے، جہاں عقل و شعور کا راج ہو وہاں الفت و پیار کا ڈنکا بھی بجے۔ جہاں عقل برہانی کارفرما ہو وہاں عقل نورانی بھی مسلط ہو۔ صرف ایک پر تکیہ کرنا، ایک پیر سے چلنے کے موافق ہوگا، تخلیق اضداد کے مرکب سے بنتی ہے۔ ہر جگہ اضداد ہیں۔ روشنی تاریکی، اونچ نیچ، چھوٹا بڑا، مرد عورت، سیاہ سفید، رات دن، آگ پانی، ٹھنڈا گرم، موت حیات وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے ملت کو قدرت کے اِس قانون سے واقف رہنا چاہیئے، تکنالوجی و اخلاقیات دونوں پر عبور چاہیئے۔

۲۱ رویں صدی ملت اسلامیہ سے کچھ اور بھی چاہتی ہے۔ وہ مذہب اسلام کے بنیادی حقائق ہیں۔ خالق کی وحدت، خلقت کی وحدت، عالمگیر برادری، اخوت و مساوات اور خدمت خلق کو اپنا شعار بنانا ہوگا۔ دوسروں کے لیے جینا اسلامی اخلاقیات میں شامل ہیں۔ یہ قدرت کا قانون ہے، جہاں کوئی شئے خود کے لیے نہیں۔ کسی اور

شئے کے لیے ہے۔ شمع خود جلتی ہے لیکن دوسروں کو روشنی بخشتی ہے۔ چند بنیادی اصول یہ ہیں:

اول یہ کہ حق کی شہرت ہو، وحدانیت کی تبلیغ ہو۔ نیوٹن نے علم طبیعات کے چکر میں، ڈارون نے ارتقا کی سوچ میں، فرائیڈ نے نفسیات کے غلبہ میں، مارکس نے معشیات کے دباؤ میں اور نیٹشے نے فوق البشر کے گھمنڈ میں خالق کو کائنات سے الگ کر دیا تھا۔ یہ اب ضروری ہے کہ الحاد کی بیخ کنی ہو۔ دوسرا کام یہ ہو کہ رنگ روپ، حسب نسب، ذات پات، فرقہ و قوم کے بندشوں کو توڑ کر بنی نوع انسان کو ایک ہی برادری میں جوڑا جائے۔ اسلام کی عظمت، اخوت و برادری میں ہے۔ یہ بات یاد رہے، " سمجھے آتش نہ کوئی آدم خاکی کو حقیر۔ نہیں اسرار سے یہ خاک کا پتلا خالی" تیسری اہم بات یہ ہے کہ انسان قدرت کے قانون کی اتباع کرے جہاں ہر شئے اپنے دائرۂ عمل میں آزاد ہے، بندش نہیں۔ قدرت کی ہر چیز معین شدہ منصوبے کی تکمیل کر رہی ہے۔ آفتاب کی گرمی و روشنی میں کمی نہیں، دن رات کے الٹ پھیر

میں تفاوت نہیں ، فرزند آدم ہی قدرت کے قانون کو توڑتا ہے۔ شجر ممنوعہ کے پاس نہ پھٹکنے کی ہدایت سے لے کر آج تک وہ سرکشی میں مبتلا ہے۔ اسی لیے ابلیس مسکرا رہا ہے: "مجھ کو آتی ہے ہنسی حضرتِ انسان پر ÷ فعلِ بد تو خود کریں ، لعنت کریں شیطان پر"
چوتھی بات یہ ہے کہ انسان کے سامنے ابھی لامحدود امکانات ہیں: "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ÷ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں"۔ بہتر ہے کہ مسلمان اس امتحان میں لگا رہے۔
پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ وہ خود بینی ، خدا بینی و جہاں بینی کو نہ بھولے۔ خود بینی میں وہ یہ خیال رکھے کہ اپنی ضمیر کی روشنی میں نیکی کی شاہراہ پر صبر و شکر و فقر کا رختِ سفر باندھ کر علم و عمل کے وسیلہ صالح زندگی پر گامزن رہے۔ خدا بینی میں وہ یہ خیال رکھے کہ توحید کے نور سے قلب کے غبار کو دھو کر اطاعت و ضبطِ نفس کے ذریعہ اعلائے کلمۃ الحق کی رسّی تھامے حق الیقین و نیابتِ الٰہی کا درجہ پالے۔ جہاں بینی میں یہ خیال رہے کہ اوصافِ حمیدہ کو ابھارتے ہوئے ، نیکی کے نقوش کو

زندگی کا مقصد سمجھ کر خدمت اہل جہاں میں لگ جائے جو دین حق کا مدعا بھی ہے، رحمت رب کی رضا بھی ہے۔ اور عز و شان انبیاء بھی ہے۔ یہ باتیں اگر موجود ہوں تو ۱۲ ویں صدی میں مسلمان کا مستقبل شاندار ہے۔

ہماری مطبوعات

جدید سیاسی فکر	سید انوار الحق حقی / ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	14/25
جدید ہندوستان کے معمار	آئی، سی، ایچ، آر / ڈاکٹر قیام الدین احمد	14/-
جغرافیہ کی ماہیت اور اس کا مقصد	ایس۔ ڈبلیو ولرج / انیس احمد صدیقی	19/-
جدید ہندوستان کے سماجی و سیاسی افکار	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	47/-
اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء	محمد اطہر علی / امین الدین	28/-
بادشاہ	میکاولی / ڈاکٹر محمود حسین	14/-
برطانیہ کا دستور اور نظام حکومت	محمد محمود فیض آبادی	36/-
تاریخ آصفی	مرزا ابو طالب / ڈاکٹر ثروت علی	10/-
تاریخ اور سماجیات	عائشہ بیگم	10/50
اسلامی تہذیب و تمدن	عماد الحسن آزاد فاروقی	14/-
اسلامی سماج	ریو بن لیوی / ڈاکٹر مشیر الحق	60/-
اکبر سے اورنگ زیب تک	ڈبلو ایچ مورلینڈ / جمال محمد صدیقی	21/50
البیرونی کے جغرافیائی نظریات	ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی	11/-
تاریخ فلسفہ سیاسیات	پروفیسر محمد مجیب	18/-
تاریخ ہندی فلسفہ	ایس۔ این داس گپتا	12/50
تحریک آزادی ہند	ظہور محمد خاں	2/25
تحریک خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	65/-
قدیم ہندوستان میں شودر	ڈاکٹر رام سرن شرما / جمال الدین محمد صدیقی	14/50
مہاتما گاندھی	بی۔ آر۔ نندا / علی جواد زیدی	60/-
مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال	ڈاکٹر ریاض احمد خاں شیروانی	37/-
مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست (دوسری طباعت)	ڈاکٹر ستیش چندر / ڈاکٹر قاسم صدیقی	22/-

فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصہ اوّل)	رتن ناتھ سرشار/امیر حسن نورانی	67/50
فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصہ دوم)	رتن ناتھ سرشار/امیر حسن نورانی	67/50
فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصہ اوّل)	رتن ناتھ سرشار/امیر حسن نورانی	50/-
فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصہ دوم)	رتن ناتھ سرشار/امیر حسن نورانی	50/-
فکر و تحقیق (۱) جنوری تا جون 1989	قومی اردو کونسل	15/-
فکر و تحقیق (۲) جولائی تا دسمبر 1989	قومی اردو کونسل	15/-
فکر و تحقیق (۳) جنوری تا جون 1990	قومی اردو کونسل	15/-
فکر و تحقیق (۴) جولائی تا دسمبر 1990	قومی اردو کونسل	15/-
فکر و تحقیق (۵) جنوری تا جون 1992	قومی اردو کونسل	20/-
فکر و تحقیق (۶) جولائی تا دسمبر 1992	قومی اردو کونسل	20/-
فکر و تحقیق (۷) جنوری تا جون 1997	قومی اردو کونسل	30/-
فکر و تحقیق (۸) جولائی تا دسمبر 1997	قومی اردو کونسل	30/-
آہنگ و عروض	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	18/-
املا نامہ	مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ	9/-
اردو تصویری لغت	شیاملا کماری/ڈاکٹر علی رفاد فتیحی	30/-
اردو صرف و نحو	ڈاکٹر اقتدار حسین خاں	16/-
اردو افعال	سونیا چرنیکوا	24/-
اردو املا (دوسری طباعت)	رشید حسن خاں	زیر طبع
اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ اوّل)	پروفیسر فضل الرحمٰن	300/-
اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ دوم)	پروفیسر فضل الرحمٰن	450/-
اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ سوم)	پروفیسر فضل الرحمٰن	450/-
اسکول لائبریری	سید حسین رضا رضوی	20/-

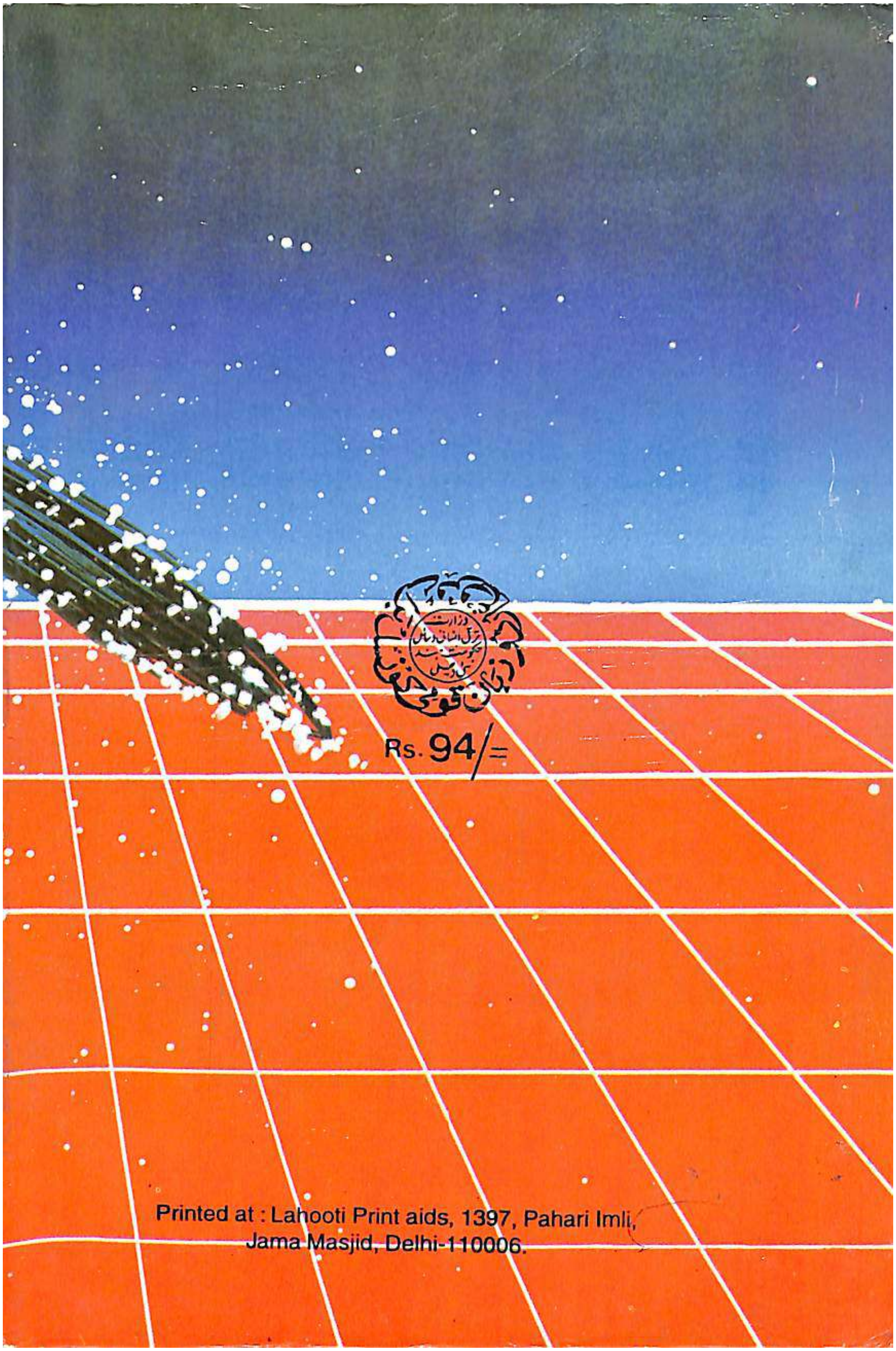

Rs. 94/=

Printed at : Lahooti Print aids, 1397, Pahari Imli,
Jama Masjid, Delhi-110006.